جب مجھے اغوا کیا گیا

منگنی کی انگوٹھی

زندگی کے میلے

جُرم اور سراغرسانی کی تین خونچکاں داستانیں

احمد یار خان

پیش لفظ

احمد یار خان کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔

تفتیش اور سراغرسانی کی کہانیوں میں احمد یار خان کا نام سند کی حیثیت کا حامل ہو گیا ہے۔ جرم اور سراغرسانی کی داستانوں میں انگریزی کے ایک افسانوی نام شرلک ہومز نے ایسی شہرت پائی تھی کہ اس کی تحریروں کے ترجمے دنیا کی ہر اُس زبان میں ہوئے جو لکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔ شرلک ہومز کا دور ختم تو نہیں ہوا لیکن ہماری نئی نسلوں نے اس کا عروج کا دور نہیں دیکھا۔

شرلک ہومز کی مقبولیت کئی ایک قلمکاروں کو جرم اور سراغرسانی کی داستان گوئی کے میدان میں لے آئی مگر ان کی تحریریں نقالی سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ انہوں نے اس صنف میں جنسی لذت اور مار دھاڑ کی چاشنی پیدا کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنجیدہ طبقوں میں جرم و سراغرسانی، جرم و جاسوسی کہلانے لگی اور قابلِ قبول نہ رہی۔ اس میں حقیقت کی بجائے

گھٹیا درجے کی لذّت پرستی اور بازاری قسم کی تفریح آ گئی۔

جرم و جاسوسی کی مانگ لذّت پرستوں اور تفریح پسندوں میں بڑھتی گئی اور یہی بازاری قسم کے ڈائجسٹ رسالوں کی مقبولیت کا باعث بنی اور اسی نے ان رسالوں کو سنجیدہ حلقوں اور شریف گھرانوں میں ناپسندیدہ قرار دیا۔

احمد یار خان اور شرلک ہومز کی کہانیاں پڑھیں تو آپ پولیس میں ہیں یا عام شہری یا آپ معاشرے کے کسی بھی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں، آپ احمد یار خان کو شرلک ہومز کے مقابلے میں زیادہ قبول کریں گے کیونکہ احمد یار خان افسانے نہیں سناتا بلکہ چار دیواری کی ڈھکی چھپی دنیا اور اپنے معاشرے کے وہ ڈرامے پیش کرتا ہے جو پڑھو تو سنسنی خیز لگتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں ہر روز ہمارے سامنے، ہمارے گھروں میں کھیلے جاتے ہیں۔

یہ کہانیاں پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ ہماری ذرا ذرا سی لغزشیں اور کوتاہیاں کیسے کیسے بھیانک المیئے بن جاتی ہیں۔ معصوم اور پاک بیٹیاں کہاں سے کہاں جا پہنچتی اور جو چیونٹی کو بھی مارنے سے گھبراتے ہیں، وہ قتل تک کر گزرتے ہیں۔

چار دیواری کی دنیا کی ذرا جتنی غلطی کا نتیجہ جب تھانے میں پہنچتا ہے تو یہ بڑی ہی سنسنی خیز اور چونکا دینے والی کہانی بن جاتی ہے — یہ کہانیاں احمد یار خان کی زبانی سنیں۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

فہرست

جب مجھے اغوا کیا گیا ۷

منگنی کی انگوٹھی ۱۸۰

زندگی کے میلے ۲۵۷

جب مجھے اغوا کیا گیا

لڑکی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے اُس کی آنکھیں اور مسکراہٹ دیکھی تو میں ایک بار تو کانپ ہی گیا۔ اس مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی اس چمک سے بچنا آسان کام نہیں تھا۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ پتھر بھی موم ہو جایا کرتے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کا دوسرا سال تھا۔ ہندوستان کی چھاؤنیوں کے پر نکل آئے تھے۔ یہ پر فوجی سامان سپلائی کرنے کی ٹھیکیداریوں نے مہیا کیے تھے۔ پورا ہندوستان فوجی کیمپ بن گیا تھا جس کسی نے فوجی نوکری کی کبھی سوچی بھی نہیں تھی وہ بھی بھرتی ہو گیا۔ فوجی بھرتی کا معیار صرف یہ رہ گیا تھا کہ جوان چلنے پھرنے اور رائفل اُٹھانے کے قابل ہو۔ سپلائی کی ٹھیکیداریوں کا یہ عالم تھا کہ درزی صبح و شام وردیاں تیار کرتے رہتے تھے۔ بڑھئی لکڑی کے کھوکھے بناتے رہتے تھے۔ راج مزدور چھاؤنیوں میں بارکیں بناتے دکھائی دیتے تھے۔ جگہ جگہ عارضی ہوائی اڈے بننے لگے۔ بیروزگاری ختم ہو گئی اور گھروں پر پیسہ عام ہو گیا۔ جن لوگوں نے وردیاں، لکڑی کے بکسے اور دیگر سامان سپلائی کرنے کے ٹھیکے لیے وہ رات ہی رات لکھ پتی ہو گئے۔ ان میں بل پاس کرنے والے دیسی افسروں اور کلرکوں کو رشوت نے دولت مند

بنا دیا۔ جنگ سے پہلے کا پرسا دکاندار جنگ کے دوسرے سال لالہ پرس رام ملٹری کنٹریکٹر اینڈ سپلائر بن گیا۔ نتّو ترکھان حاجی نبی بخش اینڈ سنز بلڈنگ کنٹریکٹر اینڈ سپلائر برائے بلڈنگ میٹریل بن گیا۔

اتنی زیادہ دولت نے ان لوگوں کے دماغ خراب کر دیئے جن کے تصور میں بھی کبھی اتنی زیادہ دولت نہیں آئی تھی۔ اس قبیل کے مسلمان، ہندو اور عیسائی دیسی انگریز بن گئے۔ انہوں نے اپنی بیٹیاں آزاد کر دیں اور وہ انگریز افسروں سے ملنے جلنے لگیں۔ جو "نو دولتیئے" شادی شدہ تھے، انہوں نے پرانے ماڈل کی بیویوں سے بدسلوکی شروع کر دی۔ خصوصاً مسلمانوں میں طلاقوں اور دوسری شادیوں کے واقعات زیادہ ہوئے۔ مسلمان کے پاس جب دولت آتی ہے تو وہ سب سے پہلے دوسری شادی کی سوچتا ہے۔ جب دوسری جنگِ عظیم میں ہندوستانیوں کے وارے نیارے ہو گئے تو جرائم بھی زیادہ ہو گئے۔ یہ واردات جو میں آپ کو سنانے لگا ہوں جنگِ عظیم کے خصوصی کیسوں میں سے ایک ہے۔ یہ واردات اُن لوگوں کے لیے حیران کن نہیں ہو گی جنہوں نے جنگِ عظیم کا زمانہ دیکھا اور جنہیں اُس وقت کی ہندوستانی سوسائٹی کا انقلاب اچھی طرح یاد ہے۔

ہندوستان کی ایک چھاؤنی کا تھانہ میرے پاس تھا۔ ایک روز تھانے میں ایک کار آئی۔ اس میں سے ایک ہندو نکلا۔ وہ ایم۔ای۔ایس

کا ٹھیکیدار تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ایم۔ ای۔ ایس فوج کا ایک محکمہ ہے جسے ٹھیکیداروں کا محکمہ کہا جاتا ہے۔ جنگِ عظیم میں جس قدر لُوٹ کھسوٹ اور رشوت اس محکمے میں ہوئی تھی وہ شاید ہی کسی اور محکمے میں ہوئی ہوگی۔ اب بھی یہ محکمہ سونے کی کان ہے۔۔۔۔ یہ ہندو جنگ سے پہلے بھی پائے کا کاروباری آدمی تھا۔ جنگ میں ایم۔ ای۔ ایس کی ٹھیکیداری نے اُسے کار اور بہت بڑی کوٹھی دے دی۔ اُس نے یہ رپورٹ دی کہ اُس کی جوان اور غیر شادی شدہ بیٹی جس کی عمر تیئیس سال تھی، گذشتہ تین دنوں سے لاپتہ ہے۔

میں نے پہلا سوال یہ کیا — "کسی کو چاہتی ہوگی؟"

"نہیں" اُس نے جواب دیا۔ "اگر ایسی بات ہوتی تو میں رپورٹ درج کرانے نہ آتا۔ وہ آخر بالغ ہے۔ مجھے کورٹ میں ذلیل کر سکتی ہے۔ اُسے اغوا کیا گیا ہے اور یہ بھی خدشہ ہے کہ اُسے قتل کر دیا گیا ہو۔"

"اغوا اور قتل کی وجہ؟"

"میری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں" — اُس نے جواب دیا — "میں نے صرف خدشے کا اظہار کیا ہے۔"

"خدشے کا کوئی باعث اور کوئی جواز ہونا چاہیے" — میں نے کہا — "یا یوں کریں کہ کسی پر آپ کو شک ہے تو اُس کا نام پتہ بتا دیں۔"

وہ خاموش رہا۔ بے چین معلوم ہوتا تھا۔ میں نے کہا — "رقابت

بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آپ نے لڑکی کا رشتہ کہیں اور طے کر دیا ہو جو لڑکی کو پسند نہ ہو اور وہ کسی ایسے آدمی کے ساتھ چلی گئی ہو جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں۔"

"رشتہ تو اُسے کوئی بھی پسند نہیں" — اُس نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا — "کہتی ہے کہ اپنی پسند کی شادی کروں گی۔ لہٰذا میں نے اس کے رشتے کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا کہ لڑکی آزاد ہے" — میں نے کہا — "بلکہ سرکش اور باغی کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ یعنی جس لڑکی کے آگے باپ نے بھی ہتھیار ڈال دیئے ہیں، وہ سرکش ہی ہوگی۔"

"ضرورت سے زیادہ سرکش ہے" — اُس نے جواب دیا — "اور ....." اُس نے جھجک کر کہا — "اور وہ غیر معمولی طور پر خوبصورت ہے۔"

اُس نے ایک لفافے میں سے دو تصویریں نکال کر میرے آگے رکھ دیں۔ دونوں لڑکی کی تھیں۔ پوز مختلف تھے۔ ایک سامنے کا اور ایک پہلو کا یعنی پروفائل۔ وہ واقعی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟" لڑکی کے باپ نے کہا — "زندہ ہے؟ اور وہ جہاں کہیں ہے وہاں اگر اپنی مرضی سے گئی ہے تو میں مجبور ہوں۔ آپ بھی مجبور ہیں۔ مجھے یہ تسلی تو ہو جائے گی کہ وہ زندہ ہے اور جہاں بھی ہے وہاں خوش ہے۔" اس کے آنسو نکل آئے۔ اُس نے کہا — "یہ میری پہلی بچی ہے۔ اُس کے

ساتھ مجھے اتنا پیار ہے جتنا اپنے دو بیٹوں سے بھی نہیں۔"

میں نے ذہن میں نوٹ کر لیا کہ لڑکی بے جا پیار سے بگڑی ہوئی ہے۔ ایسے بچے جوان ہو کر من مانی کیا کرتے ہیں۔ میں نے پوچھا — "اس سے پہلے کبھی ایک دو دنوں کے لیے غیر حاضر رہی ہے؟"

"نہیں۔" اُس نے جواب دیا — "سوشل لڑکی ہے۔ کبھی کبھی رات ذرا دیر سے آتی ہے لیکن آجاتی ہے۔"

"سوشل ہے؟" — میں نے قدرے چونک کر پوچھا — "اس کی وضاحت کر دیں۔ کس قسم کی سوسائٹی میں جاتی ہے؟"

"میرا زیادہ تر تعلق فوجی افسروں کے ساتھ ہے" — اُس نے جواب دیا — "میں ان کی پارٹیوں وغیرہ میں جاتا رہتا ہوں۔ کچھ افسروں کو معلوم تھا کہ میری بیٹی جوان ہے اور بی۔ اے ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہر پارٹی میں عورتیں آتی ہیں ان میں انگریز عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس لیے اپنی بیٹی کو ساتھ لے آیا کرو، تعلقات بڑھیں گے۔ مجھے اب اس غلطی کا احساس ہو رہا ہے کہ میں نے اُسے پارٹیوں وغیرہ میں لے جانا شروع کر دیا۔ لڑکی بڑی ہوشیار نکلی۔"

"پھر اُس نے خود پارٹیوں وغیرہ میں جانا شروع کر دیا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں!" — "اُس نے کہا — "اس نے دو تین دنوں میں انگلش ڈانس سیکھ لیا تھا۔"

مجھے اب زیادہ سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور یہ پوچھنا

تو میں نے ضروری ہی نہیں سمجھا کہ لڑکی کا چال چلن کیسا ہے۔ وہ تو صاف ظاہر تھا کہ کیسا ہوگا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مجھے یہ شک ہوا کہ کسی افسر یا افسروں کے ساتھ کسی پہاڑی مقام مثلاً شملہ، مسوری یا ڈلہوزی چلی گئی ہوگی۔

اس کے بعد میرے دماغ میں ایک اور جگہ آئی جہاں اُس کے جانے کا امکان تھا۔ یہ جگہ تھی کسی مہاراجے یا نواب کا حرم۔ آج کل تو یہ مہاراجے اور نواب بھوکے مر رہے ہیں۔ انگریزوں کی بادشاہی میں یہ لوگ بھی بادشاہ تھے۔ اپنی اپنی ریاست میں شہنشاہ تھے۔ ان کے پاس اندھی دولت تھی۔ ان کے ایجنٹ گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ جہاں کوئی خوبصورت لڑکی نظر آئی اُسے حرم کے لیے پھانسنے یا خریدنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑی بڑی طرحدار لڑکیاں کسی نواب صاحب کی چہیتی بیگم بلکہ رانی بننے کے لیے گھر سے بھاگ جاتی تھیں۔ حرم میں جا کر انہیں پتہ چلتا تھا کہ ان جیسی بیسیوں لڑکیاں محل کی قیدی اور بے نکاحی بیویاں بنی ہوئی ہیں۔

مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ بھی رانی بننے کے جھانسے میں آگئی ہے تو پھر اس کا سراغ بھی نہیں ملے گا۔ برآمدگی اور واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کے باپ سے اس خطرے کا ذکر کر دیا۔

اُس نے کہا — "آپ یہ سراغ لگا دیں کہ کون سے مہاراجے یا نواب کے پاس ہے۔ میں فوج کے انگریز افسروں کا اثر استعمال کر کے اُسے وہاں سے نکلوا لوں گا۔" اُس نے ذرا سوچ کر کہا — "آپ اگر اس میں ذاتی دلچسپی

ہیں تو میں آپ کو اتنی زیادہ فیس دوں گا جتنی آپ مانگیں گے۔ میری رپورٹ رجسٹر کریں یا نہ کریں، یہ آپ کی مرضی ہے۔ اسے پرائیویٹ کیس سمجھیں۔"

میں نے اُسے بتایا کہ یہ میرا فرض ہے جس کی میں کوئی فیس نہیں لوں گا۔

اُس نے کہا — "مجھے ڈر ہے کہ آپ نے یہ کیس رجسٹر میں ڈال دیا تو رجسٹر میں ہی پڑا رہے گا۔ آپ کے پاس اور بھی بہت سے کیس ہوں گے۔"

میں نے اُسے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ میں ٹال مٹول نہیں کروں گا۔ پھر اُسے کہا کہ وہ ذہن پر زور دے کر اور اچھی طرح یاد کر کے بتائے کہ لڑکی کا زیادہ تر میل جول کس کس کے ساتھ تھا اور اسے کس پر شک ہو سکتا ہے۔ اُس نے سب سے پہلے ایک مسلمان میجر کا نام لیا۔ یہ ایم۔ ای۔ ایس کا میجر تھا۔ اس کے علاوہ بھی اُس نے چند ایک نام بتائے لیکن زیادہ زور اسی مسلمان میجر پر دیا اور کہا — "چھاؤنی میں سکینڈل بن گیا ہے۔ اِس میجر کے دو بچے ہیں۔ اس کی بیوی اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے۔"

میرے مزید پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ میجر کی بیوی پردہ نہیں کرتی۔ امیر کبیر والدین کی بیٹی ہے۔ سوشل نہیں۔ اچھی دل کش شکل وصورت کی عورت ہے۔ میجر کی اور اس کی ناچاقی ہو گئی ہے۔ میری لڑکی کو زیادہ تر اسی کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔

بہت سی اور ضروری باتیں پوچھ کر میں نے رپورٹ درج کر لی اور ہندو ٹھیکیدار چلا گیا۔ یہ اُس ہائی کلاس سوسائٹی کا ڈرامہ معلوم ہوتا تھا

جو ہندوستانی معاشرے میں جنگِ عظیم میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ حرام کی دولت کی پیداوار تھی۔ جب ملک تقسیم ہُوا تو یہ سوسائٹی پاکستان کے حصے میں بھی آئی۔ اس کی آمدنی کا ذریعہ سرکاری ٹھیکیداریاں اور رشوت تھی۔ اس لیے اس سوسائٹی نے اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لیے پاکستان کی بنیاد ہی ٹھیکیداریوں اور رشوت پر رکھی۔ اب آپ اپنے ملک میں معاشرے کی اس کلاس کو دیکھ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کے گھروں میں یہی حرکتیں ہوتی ہیں جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ بیٹیاں سوشل۔ ہر کسی سے ملتی ملاتی اور بدکاری کرتی ہیں۔ خاوندوں اور بیویوں میں ناچاقی رہتی ہے۔ لڑکیاں من مانی کرتی ہیں مگر پولیس تک کوئی واردات نہیں پہنچتی کیونکہ اس بے حیائی اور بدکاری کو ان لوگوں نے "تہذیب" میں شامل کر لیا ہے۔

اس ہندو ٹھیکیدار نے اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ اس لیے دی تھی کہ ابھی وہ لڑکی کی اس حرکت کو جرم سمجھ رہا تھا۔ "نئی تہذیب" نے ابھی جڑ نہیں پکڑی تھی۔ خود میرے لیے بھی یہ حرکتیں نئی اور قابلِ اعتراض تھیں اور ہیں۔ مجھے جب یہ پتہ چلا ایک ہندو لڑکی کی وجہ سے ایک مسلمان گھرانہ اُجڑ رہا ہے تو میں نے اِس کیس میں ذاتی دلچسپی لینے کا ارادہ کر لیا۔

آدمی عیاش تھا

چھاؤنی میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہاں افسروں کے بیروں، خانساموں اور بھنگیوں کی ایک فوج رہتی ہے۔ یہ لوگ پولیس کے لیے کارآمد ہوتے ہیں۔ میں انہیں بہترین مخبر سمجھا کرتا تھا۔ پولیس کے خلاف بھی مخبری کرتے تھے اور حق میں بھی۔ دیسی افسروں اور اُن کی بیویوں کے اِدھر اُدھر ناجائز تعلقات میں یہ لوگ خاص پارٹ ادا کرتے تھے۔ کوٹھیوں اور بنگلوں کے اندر کی دنیا کی صحیح خبریں دیتے تھے۔ میں نے ان میں سے کم و بیش بیس آدمی اپنی "مخبر پلاٹن" میں شامل کر رکھے تھے۔ یہ کیس چونکہ ایم۔ای۔ایس کے ایک ٹھیکیدار کی بیٹی کا اور ایم۔ای۔ایس کے ہی ایک میجر کا تھا، اس لیے میں نے ایم۔ای۔ایس کے آفیسرز میس کے دو خصوصی بیروں کو بلوایا۔

وہ رات کو کام سے فارغ ہو کر آئے۔ لڑکی کے متعلق انہوں نے نہایت دلچسپ اور لذیذ باتیں بتائیں اور کہا کہ انگریز افسر اپنی میموں کو بھول گئے ہیں۔ ان بیروں کی اطلاع کے مطابق لڑکی آفیسرز میس کے بڑے کھانے میں ضرور جاتی ہے۔ انگریز افسروں کے ساتھ ڈانس کرتی ہے اور اس کا باپ بھی ساتھ ہوتا ہے۔ ان دونوں نے لڑکی کے حُسن کی تعریفیں اپنی زبان اور اصطلاحوں میں بڑے ہی اشتعال انگیز انداز سے کیں۔

مسلمان میجر کے متعلق انہوں نے بتایا کہ اُس کی عمر تیس سال سے اوپر ہو گئی ہے۔ عیاش آدمی ہے۔ ٹھیکیداروں سے بہت رشوت لیتا ہے۔ اُس کی بیوی خوبصورت ہے اور اس کے دو بچے ہیں۔ وہ کبھی میس میں نہیں آئی۔ وہ چھاؤنی میں ایک بنگلے میں رہتی ہے۔

ان بیروں کی معرفت اگلے روز بنگلے کے دو اور ملازم آ گئے۔ یہ دونوں مسلمان میجر کے بنگلے کے پڑوس کے بنگلوں میں ملازم تھے۔ انہوں نے بتایا کہ یہ ہندو لڑکی کبھی کبھی اس میجر کے گھر آتی ہے اور انہیں باہر بھی اکٹھے دیکھا گیا ہے۔ افسروں میں اٹھنے بیٹھنے والی یہ ایک ہی لڑکی نہیں تھی، اور بھی بہت سی ہندو، سکھ اور عیسائی لڑکیاں ایڈوانس ہو گئی تھیں۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ اُن میں مسلمان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان سب کے باپ یا خاوند انہیں انگریز افسروں سے ملوا کر بلکہ اُن کے حوالے کر کے فخر کیا کرتے تھے لیکن یہ ہندو لڑکی جو لاپتہ ہو گئی تھی بہت مشہور تھی۔ بیروں نے بتایا کہ بہت شوخ اور چلبلی لڑکی ہے۔

مسلمان میجر کے متعلق انہوں نے بتایا کہ عیاش اور شرابی ہے۔ تقریباً ایک مہینے سے وہ بنگلے میں اکیلا رہتا ہے۔ اس کی بیوی اپنے والدین کے گھر چلی گئی ہے۔ میاں بیوی میں اسی لڑکی پر جھگڑا رہتا تھا۔ ایک گھریلو ملازم نے یہ بھی وثوق سے بتایا کہ میجر کی بیوی کے ایک آدمی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ بیوی اسی شہر کے مضافاتی علاقے

میں رہتی تھی۔ اس کا باپ امیر قسم کا زمیندار تھا۔ اراضی مزارعوں کے سپرد تھی۔ بہرحال یہ سب حرام کی دولت بے جا آزادی اور انگریزوں کی نقل کرتے ہوئے بے حیا ہو جانے کا چکر تھا۔

میں نے اس میجر کے خانسامے کو چھاؤنی کے دوسرے ملازموں کی معرفت قابو کر لیا۔ اس نے میجر کا چال چلن وہی بتایا جو دوسرے بتا چکے تھے۔ بہت دیر تک پوچھ گچھ کرنے کے بعد نئی بات یہ سامنے آئی کہ ایک انگریز لیفٹیننٹ کرنل جس کا نام جانسن بتایا گیا، اکثر اس میجر کے گھر آتا ہے۔ دو تین بار یہ لڑکی بھی کرنل جانسن کے ساتھ آئی تھی۔ تینوں الگ کمرے میں بیٹھے شراب پیتے رہے تھے۔

خانسامے نے یہ بھی بتایا کہ میجر کی بیوی کا ایک امیر کبیر آدمی کے ساتھ دوستانہ ہے۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ آپ اسے ارشد کہہ لیں۔ یہ آدمی میجر کے سسرال کی برادری کا تھا۔ میجر کی بیوی کوئی دو مہینے سے میجر کے ساتھ کھچی کھچی رہنے لگی اور اس نے ارشد کے ساتھ اس حد تک دوستانہ کر لیا کہ میجر کی موجودگی میں ارشد کے ساتھ باہر چلی جاتی تھی۔ یہ بھی انکشاف ہوا کہ دو دفعہ کرنل جانسن میجر کی غیر حاضری میں میجر کی بیوی کے پاس آیا اور بیوی نے اسے بڑے غصے سے گھر سے نکال دیا۔ خانسامے نے میرے پوچھنے پر بتایا کہ گذشتہ ایک ہفتے سے یہ ہندو لڑکی میجر کے پاس نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکی اگر اس میجر کی خاطر

گھر سے نکلی ہے تو وہ کہیں اور روپوش ہے۔

مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ اتنی آزاد لڑکی اگر میجر کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے تو اسے گھر سے بھاگنے اور روپوش ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے باپ نے اس کی شادی اسی کی مرضی پر چھوڑ دی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ باپ نے اسے یہ بھی کہا ہو کہ اگر اس نے مسلمان کے ساتھ شادی کی تو اسے قتل کرا دیا جائے گا۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ میجر اپنی بیوی کو طلاق دے کر شادی کرے گا اور پھر یہ خیال بھی آیا کہ یہ مسلمان میجر بالکل ہی بے قصور ہو سکتا ہے۔

چھاؤنی میں ایک گورا رجمنٹ بھی تھی جس کے سپاہیوں نے تین چار بار بازار میں شراب پی کر ہلڑ بازی کی تھی۔ ان انگریز سپاہیوں کو ہم ٹامی کہا کرتے تھے بلکہ ہندوستان میں مشہور تھا کہ گورے سپاہی اپنے باپ کی نسل سے نہیں ہوتے، سب حرامی ہوتے ہیں۔ اس رجمنٹ کے چار سپاہیوں نے ایک بار ایک دیہاتی لڑکی کو پکڑ لیا تھا۔ دیہاتیوں نے گوروں پر لاٹھیوں سے حملہ کر دیا اور لڑکی کو بچا لیا۔ مجھے یہ خدشہ بھی نظر آنے لگا کہ لڑکی کہیں ان گوروں کے ہاتھ نہ چڑھ گئی ہو۔ اس صورت میں انہوں نے اسے خراب کر کے جان سے ہی مار دیا ہو گا۔ اس صورت میں ایک دیسی تھانیدار محض مجبور اور بے بس تھا۔

ہندو لڑکی کے ساتھ تعلقات

تمام امکانات پر غور کرکے میں نے سب سے پہلے میجر کی بیوی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ کورا ذہن لے کر میجر سے ملنا بیکار تھا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ کہہ دیتا کہ جی ہاں لڑکی میرے پاس ہے۔ میں نے اُس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرکے اسے گھیرنا بہتر سمجھا تھا۔ اس کی بیوی کے گھر جاکر میں اُس کے باپ سے ملا اور اُسے بتایا کہ ایک ہندو لڑکی لاپتہ ہوگئی ہے، جس کے باپ نے میجر پر شک کیا ہے اور میں میجر کی بیوی سے میجر کے چال چلن اور اس لڑکی کے ساتھ تعلقات کے متعلق کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

باپ نے یعنی میجر کے سسر نے میجر کے خلاف بہت سی باتیں کیں جن میں سے کوئی ایک بھی بات میرے کام نہیں آسکتی تھی۔ اپنے دل کا غبار نکال کر اُس نے مجھے اپنی بیٹی سے ملنے کی اجازت دے دی۔ اس لڑکی کو عورت کہنا زیادتی تھی۔ وہ جوان لڑکی تھی۔ دو بچوں کی ماں ہوتے ہوئے اصل عمر سے چھوٹی لگتی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ میجر اتنی دل کش لڑکی کے مقابلے میں کسی اور کو پسند کرتا ہے لیکن میجر عیاشیوں کا دلدادہ تھا۔ اس

کی بیوی کے متعلق میں نے یہ رائے قائم کی کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔ اُس نے جب میرے ساتھ باتیں شروع کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیدھی سادی گھریلو عورت نہیں۔ باتیں پُر اثر کرتی تھی اور بولنے کا انداز باوقار تھا۔ وہ اپنی حیثیت، اپنے حُسن اور اپنی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ تھی۔

اُس نے بتایا کہ اُسے گھر میں روپے پیسے کی کوئی تنگی نہیں بلکہ گھر میں پیسہ ہی پیسہ تھا۔ یہ سب ٹھیکیداروں سے لی ہوئی رشوت تھی۔ اس اندھے پیسے نے اس کے خاوند کو پاپی بنایا۔ رشوت کی پہلی رقم گھر آتے ہی اس نے شراب پینی شروع کردی۔ پھر بیوی کو بھی شراب پینے پر اُکسانے لگا مگر وہ نہ مانی۔ بیوی کو وہ انگریزوں کی طرح ہر جگہ اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ بیوی نے یہ بھی پسند نہ کیا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ برقعہ اتار دیا اور اُس کے ساتھ باہر جانے لگی لیکن صرف پکچر دیکھنے یا سیر وغیرہ کے لیے۔ یہ عورت صرف آٹھ جماعتیں پڑھی ہوئی تھی۔ میجر نے اسے انگریزی پڑھانی شروع کردی اور اس کے ساتھ ہی گھر میں افسروں کی دعوتیں کرنے لگا جن میں بیوی کو ساتھ رکھتا تھا۔

"یہ لوگ اس قدر بے حیا اور بدنیّت تھے کہ میرے خاوند کے سامنے میرے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کرتے تھے اور بیہودہ باتیں کہہ گزرتے تھے۔" اس عورت نے کہا۔ "میں دیکھ

دیکھ کر حیران ہوتی تھی کہ ان لوگوں کی اصلیت کیا ہے اور یہ کیا بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

مختصر یہ کہ خاوند اُسے اپٹوڈانس اور سوشل بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ نہ مانی۔

گذشتہ چھ مہینوں سے اُس کے خاوند کے تعلقات اس ہندو لڑکی کے ساتھ شروع ہوئے۔ وہ میجر کے گھر میں ایک دعوت میں آئی تھی۔ اس کے بعد میجر نے اپنی بیوی کو سوشل بنانے کی کوششیں ترک کر دیں اور اُس کی دل چسپیاں باہر بڑھنے لگیں۔ میجر اپنی بیوی کو اس لڑکی کی طرح بننے کو کہتا تھا اور لڑکی کی تعریفیں کرتا تھا۔ لڑکی اس کے گھر کئی دفعہ آئی۔ ابتدا میں لڑکی نے میجر کی بیوی کو اپنی طرح آزاد ہونے پر اکسایا مگر بیوی اُس کی باتوں میں نہ آئی۔ اس کے کہنے کے مطابق یہ لڑکی اور میجر یہ چاہتے تھے کہ میں بھی آزاد ہو کر دوسرے مردوں کے ساتھ دوستی کر لوں تاکہ میں اپنے خاوند کو عیاشی سے روک نہ سکوں۔

جوں جوں ہندو لڑکی کے ساتھ میجر کے تعلقات بڑھتے گئے، اپنی بیوی میں اُس کی دل چسپی گھٹتی گئی۔ اب یوں ہوتا تھا کہ لڑکی اُس کے گھر آتی تھی تو میجر کی بیوی سے ملتی بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں الگ کمرے میں بیٹھے رہتے۔ پھر اس کے گھر میں ایک انگریز کرنل آنے لگا۔ وہ عموماً رات کے وقت آتا تھا۔ میجر نے اپنی بیوی کا

اُس کے ساتھ تعارف کرایا۔ کرنل اُردو بولتا اور سمجھتا تھا۔ اُس نے پہلی ملاقات میں ہی اس عورت کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ یہ کوشش بیہودہ تھی۔ اس انگریز نے میجر کی بیوی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور پہلے اُس کا ہاتھ چوما پھر اُس کے گال چوم کر میجر سے کہا — "تم نے یہ تو نہیں بتایا تھا کہ تمہاری بیوی اتنی زیادہ خوبصورت ہے۔"

کرنل چلا گیا تو بیوی میجر پر برس پڑی۔ میجر ہنستا رہا۔ اُس نے کہا کہ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ہم لوگ پسماندہ ہیں۔ انگلینڈ میں عورت کے حسن کی تعریف منہ چوم کر کی جاتی ہے .... غرض، میجر اس بے حیائی کی تعریفیں کرتا رہا اور اس کی بیوی اُس پر اور اُس کی تہذیب پر لعنت بھیجتی رہی۔ کرنل اس کے بعد بھی آتا رہا۔ تین چار بار یہ ہندو لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔

ایک دن میجر، کرنل اور یہ لڑکی میجر کے گھر ایک کمرے میں بیٹھے۔ انہوں نے وہیں شراب منگوائی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد بیوی نے باہر کی طرف جا کر کھڑکی میں سے جھانکا۔ پردے پڑے ہوئے تھے لیکن دو پردوں کے درمیان ذرا سا فاصلہ تھا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ اُس نے شیشے اور پردوں میں سے جو کچھ دیکھا، اس سے اُس کا خون کھول اُٹھا۔ یہ نوجوان ہندو لڑکی جس کی ابھی شادی بھی نہیں ہوئی تھی مادر زاد ننگی تھی اور کرنل اور

میجر وحشی بنے ہوئے تھے۔

بیوی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ بہت روئی اور سوچتی رہی کہ کیا کرے۔ اس کا خاوند اُسے غیر مردوں کے ساتھ اسی سطح پر لانا چاہتا تھا۔ رات بہت دیر بعد کرنل اور لڑکی چلے گئے۔ میجر سونے کے کمرے میں آیا تو بیوی نے گلہ شکوہ کیا۔ میجر نے الزام کی تردید کر دی۔ اس پر جھگڑا ہوا اور پھر یہ جھگڑا آئے دن ہونے لگا۔

انگریز کرنل دو دفعہ میجر کی غیر حاضری میں اُس کے گھر گیا اور اُس کی بیوی سے بیہودہ بے تکلفی کی۔ بیوی نے اُسے دھتکارنے کی کوشش کی تو اُس نے ایک ہزار روپیہ پیش کر دیا۔ اس عورت نے اُسے کہا کہ میں تمہیں کئی ہزار روپیہ دے سکتی ہوں۔ کرنل چلا گیا۔ میجر گھر آیا تو بیوی نے اُسے کہا کہ تم باہر سے لڑکی لا کر گھر میں بدکاری کرتے بھی ہو اور کرنل سے کراتے بھی ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کرنل نے مجھے بھی طوائف سمجھ لیا ہے۔

اس واقعہ کی تفصیل سن کر میجر طیش میں آگیا۔ اس نے کہا ”میں خود بدکار ہو سکتا ہوں، بیوی کو بدکار نہیں ہونے دوں گا۔“

اس سے بیوی کو اتنا سا اطمینان ضرور ہوا کہ اس کے خاوند کے دل میں غیرت ابھی زندہ ہے۔ خاوند نے اُسے بعد میں بتایا نہیں کہ کرنل کے ساتھ اس کی اس معاملے میں بات ہوئی ہے یا نہیں۔ معلوم نہیں کرنل ڈھیٹ تھا یا میجر کی کمزوری تھی کہ ایک ہفتے بعد کرنل پھر آگیا۔ میجر

گھر نہیں تھا۔ کرنل نے پھر وہی بیہودہ خواہش ظاہر کی اور ایک ہزار نقد کے علاوہ ریشمی کپڑوں کا وعدہ کیا۔ یہ لوگ ہندوستانیوں کو غریب اور اپنا غلام سمجھتے تھے۔

”کرنل جانسن!“ اس عورت نے اُسے کہا — ”میں ایک ہزار روپیہ دے کر تمہیں اس طرح قتل کرا سکتی ہوں کہ تمہاری لاش بھی کسی کو نہیں ملے گی“ — اس نے کرنل جانسن کی اتنی بے عزتی کی کہ اردلی، اور خانساماں آواز سن کر دوڑے آئے۔ کرنل چلا گیا۔

بیوی نے میجر کو بتایا تو میجر نے غصے کا اظہار تو کیا لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ کمبخت کرنل ہے اور انگریز ہے۔ اس کے خلاف رپورٹ کرنا بھی خطرناک ہے۔ بہرحال بیوی کے بیان کے مطابق میجر بہت بے چین ہو گیا تھا مگر اس نے اپنی روش نہ بدلی۔ اس کے بعد بھی یہ ہندو لڑکی اس کے ساتھ گھر آتی رہی۔ وہ ایک کمرے میں بند ہو جاتے تھے اور بہت دیر بعد لڑکی جاتی تھی۔ بیوی کی قوت برداشت جواب دے گئی اور گھر میں جھگڑے اتنے بڑھے کہ وہ اپنے گھر آگئی — اُس نے اپنا بیان یہیں پر ختم کر دیا۔

باوقار عورت عیاش لڑکی

”میجر صاحب نے آپ پر کسی کے ساتھ تعلقات پیدا کرنے کا الزام

لگایا تھا۔ یہ کہاں تک صحیح ہے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا۔

اسے غالباً توقع نہیں تھی کہ مجھے اس بات کا علم ہوگا۔ عورت چونکہ ہوشیار تھی اس لیے اس نے نہایت اچھا جواب دیا۔ کہنے لگی۔

"عورت پہاڑوں سے ٹکرا سکتی ہے لیکن صرف اتنا سا الزام کہ کسی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں اسے گھٹنوں بٹھا دیتا ہے۔ عورت کو ذلیل کرنے اور اس کا منہ بند کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس پر بدکاری کا الزام عائد کردو۔ یہی الزام مجھ پر عائد کیا گیا اور میں خاوند کے اگلے فیصلے کے انتظار میں گھر بیٹھ گئی۔"

میں نے اس عورت کے متعلق یہ رائے قائم کرلی تھی کہ یہ کوئی بدھو بیوی نہیں۔ چاہے تو کسی کو بھی انگلیوں پر نچا سکتی ہے۔

"ارشد کون ہے؟" ۔۔۔ میں نے پوچھا ۔۔۔ "کیا اس کا آپ کے گھر آنا جانا تھا؟"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ مسکرائی۔ کہنے لگی ۔۔۔ "میرا خیال تھا کہ آپ کو اس کے متعلق معلوم نہیں ہوگا۔ آپ شاید میرے خاوند سے مل آئے ہیں۔ اس نے میرے بارے میں آپ کو کیا بتایا ہے؟"

"آپ اس کی پرواہ نہ کریں کہ آپ کے بارے میں کسی نے مجھے کیا بتایا ہے" ۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ سمجھ لیں کہ آپ کے معاملے میں میرا ذہن بالکل صاف ہے۔ پولیس کی طرف سے آپ پر کوئی الزام عائد

نہیں کیا گیا نہ کیا جائے گا۔ آپ کے کسی کے ساتھ تعلقات ہیں یا نہیں اس کا ہندو لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اگر مجھے کچھ سچی باتیں بتا دیں گی تو میں آپ کا مشکور ہوں گا۔"

پھر میں نے اس کے دل پر قبضہ کرنے کے لیے کہا۔ "آپ نے میرے دل میں اپنے خاوند کے خلاف خاصی نفرت پیدا کردی ہے۔ وہ آپ جیسی باوقار عورت کو ایک ہندو لڑکی کی خاطر پریشان کرتا رہا ہے۔ وہ غالباً آپ کو طلاق دے کر اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے جو میں نہیں ہونے دوں گا۔ آپ ارشد کے متعلق مجھے بتا دیں کہ یہ الزام آپ پر کس طرح عائد ہوا ہے۔"

"یہ ایک ناٹک تھا" ۔۔۔ اس نے جواب دیا ۔۔۔ "ارشد ہماری برادری کا ایک شادی شدہ آدمی ہے۔ آپ اسے میرا منہ بولا بھائی کہہ سکتے ہیں۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ خاوند میرے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں جو آپ کو سنائی ہیں اسے بھی میں سناتی رہتی تھی۔ ایک روز ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ ارشد میرے پاس آنا شروع کردے اور اس قسم کی ایکٹنگ کی جائے کہ ہماری دوستی ہوگئی ہے۔ ہم نے اس امید پر یہ پروگرام بنایا تھا کہ میرے خاوند کی غیرت جاگ اٹھے گی اور وہ مجھے ارشد سے ملنے سے روکے گا۔ پھر میں اسے کہوں گی کہ تم اپنی مرضی کی لڑکی کے ساتھ بدکاری کرسکتے ہو تو میں بھی اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ من مانی کرسکتی ہوں۔ ارشد بہت

دلیر آدمی ہے۔ اُس نے میرے پاس آنا شروع کر دیا .....

" ایک بار ایسے ہُوا کہ ارشد میرے پاس بیٹھا ہُوا تھا۔ میرا خاوند گھر نہیں تھا۔ اُس کے آنے کی آواز آئی تو میں اور ارشد ایک ہی صوفے پر ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے۔ خاوند کا پاؤں دروازے میں پڑا تو ہم چونک کر اور گھبرا کر دُور دُور سرک گئے۔ خاوند کا رنگ بدل گیا مگر وہ بولا نہیں۔ ارشد چلا گیا۔ خاوند نے مجھ سے پوچھا کہ ارشد اور تم اتنی قریب بیٹھے کیا کر رہے تھے؟ میں نے جواب دیا — 'جو تم اور وہ ہندو لڑکی کیا کرتے ہو؟' — وہ چُپ ہو گیا۔ اس کے بعد چوتھے پانچویں روز ارشد آ جاتا اور پھر یوں بھی ہُوا کہ خاوند گھر میں موجود تھا۔ ارشد آیا اور میں خاوند کو بتائے بغیر اس کے ساتھ پکچر دیکھنے چلی گئی .....

" خاوند کو یقین ہو گیا کہ میرے اور ارشد کے تعلقات قائم ہو چکے ہیں۔ اُس نے ایک روز مجھے ارشد سے ملنے سے روکا۔ میں نے اُسے اس ہندو لڑکی سے ملنے سے روکا۔ پھر اُس نے جو کچھ کہا میں نے اسی طرح جواب دیا۔ وہ پریشان ہو گیا اور میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ میرا اتنا پیارا گھر بدکاری کا اڈہ بن گیا تھا۔ حالانکہ میں بدکار نہیں تھی۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ خاوند کے راستے پر چل نکلوں گی مگر اس ناٹک کو بھی میں بدکاری سمجھتی تھی۔ میں اپنے سہاگ کو دھوکہ دے رہی تھی۔ میں اتنی روئی کہ اپنے اوپر

قابو نہ رہا۔ اسی کیفیت میں خاوند سے کہا کہ وہ سیدھے راستے پر آجائے، مگر شراب اور اندھی آمدنی نے اُس کی عقل پر پردہ ڈال رکھا تھا۔ اُس پر اس کا اثر تو بہت ہُوا کہ میں نے ارشد کے ساتھ ناجائز دوستی کر لی ہے لیکن اُس نے اپنی عادت بدلنے کی ذرہ بھر کوشش نہ کی۔ یہ سلسلہ تین چار مہینے چلا۔ ہمارے جھگڑے بڑھتے گئے۔ آخر خاوند نے مجھے کہا کہ میں اپنے گھر چلی جاؤں۔ میں اپنے گھر آگئی۔ دو مہینے ہو گئے ہیں۔"

میں ان کے اس ناٹک پر تنقید کر سکتا تھا لیکن میری تفتیش کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مجھے ہندو لڑکی کا سراغ لگانا تھا۔ اس میجر کی بیوی بدکار تھی یا نہیں اس سے میرا واسطہ ہی نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے مجھے راہنمائی ملی کہ اپنی بیوی کو راستے سے ہٹانے کے لیے میجر کو معقول بہانہ مل گیا تھا مگر یہ سوال میرے لیے پریشانی کا باعث تھا کہ لڑکی کو گھر سے غائب ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

میں نے ارشد کا پتہ معلوم کر لیا تھا۔ اُسے ملا۔ مجھے چند ایک باتوں کی تصدیق کرنی تھی۔ ارشد اُن لوگوں میں سے تھا جو ایک ہی وقت دیہاتی بھی ہوتے ہیں اور شہری بھی۔ یعنی ان میں شہریوں والی نفاست اور فیشن بھی ہوتا ہے اور دیہاتیوں والا گنوار پن بھی۔ یہ لوگ کسی کے سر پر لٹھ مار کر "آئی ایم سوری" کہنے والے لوگ

ہوتے ہیں۔ جوان آدمی تھا اور شادی شدہ۔

میں اسے ملا تو اُس نے پہلوانوں کی طرح جھوم کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولا — "ہاؤ جی ملک صاحب!" — اور اُس نے کسی کو آواز دے کر بڑی ہی دبنگ آواز سے کہا — "دودھ میں برف ڈال کر لے آؤ، جگ میں"۔

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ غیر معمولی طور پر دلیر آدمی ہے اور یہ بھی کہ جنسِ مخالف کے لیے اس میں کشش تھی۔ اس کے مزاج میں شگفتگی بھی تھی۔ میں نے اُسے ملاقات کا مطلب بتایا۔

اس نے میرے زانوں پر ہاتھ مار کر کہا — "اس لڑکی کے لیے میں اس قسم کے ایک درجن میجر قتل کر سکتا ہوں۔ یہ میجر (گالی) اس قسم کی وفادار اور شکل دار لڑکی کو تنگ کرتا رہا ہے۔ اُس نے جب مجھے بتایا تو میں نے اُسے کہا کہ میں اسے سیدھا کر دیتا ہوں۔ تمہارے قدموں میں ناک کی لکیریں نکالے گا لیکن یہ لڑکی اتنے مضبوط دل والی ہے کہ اپنے خاوند کے خلاف کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھی"۔

وہ میرے پوچھے اور کہے بغیر میجر کی بیوی کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا تھا۔ انسان کو اتنا باتونی نہیں ہونا چاہیئے کہ منہ میں جو آئے کہتا چلا جائے۔ میجر کی بیوی کی تعریفیں کرتے کرتے اُس نے کہا — "اِدھر ہماری بیوی ہے جیسے کھُرلی پر گائے بندھی ہوئی

ہو۔ بلاؤ تو دس منٹ بعد بولتی ہے۔ ہنساؤ تو منہ بسور لیتی ہے۔ اس کے آگے روؤ تو ہنس پڑتی ہے مگر ہم ہیں کہ برادری کو خوش رکھنے کے لیے اپنے دل پر پتھر رکھے ہوئے ہیں"۔

اُس کی باتیں مجھے شک میں ڈال رہی تھیں۔ میرے دماغ میں یہ سوچ آئی کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ میجر کی بیوی کو آباد کرنے کے لیے ہندو لڑکی کو اسی نے غائب کر دیا ہو۔ میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس میں خطرہ مول لینے کی ہمت موجود ہے۔ میں نے اس شک کو سامنے رکھ کر اس پر سوال کیے، لقمے دیئے، اسے دوستی اور ہمدردی کے خوبصورت جھانسے دیئے مگر وہ مجھے اس جرم سے صاف نظر آرہا تھا۔ اس نے میجر کی بیوی کی ساری باتوں کی تصدیق کی اور بتایا کہ وہ دونوں میجر کو راہِ راست پر لانے کے لیے ناٹک کھیلتے رہے ہیں۔

میرا اس ناٹک کے ساتھ کوئی تعلق تو نہیں تھا پھر بھی میں نے اُسے کہا — "اس ناٹک کا نتیجہ آپ نے دیکھ لیا ہے۔ میجر نے ہر جگہ مشہور کر دیا ہے کہ اُس کی بیوی کے آپ کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ اُسے آپ لوگ برادری میں بٹھا کر شرمسار اور ذلیل کرتے۔ اب آپ کی گردن اُس کے پاؤں کے نیچے آگئی ہے۔ اب وہ بیوی کو طلاق دینے اور دوسری شادی کرنے کا معقول بہانہ حاصل کر چکا ہے"۔

اُس نے آہستہ سے کہا — "یہ دیکھا جائے گا"۔

میں شادی شدہ ہوں

میں نے اس آدمی کو ذہن سے اتارا نہیں۔ امکان موجود تھا کہ اس نے لڑکی کو غائب کیا ہے۔ میں نے یہ خاص طور پر نوٹ کیا کہ وہ میجر کی بیوی میں غیر معمولی دل چسپی لے رہا تھا۔ وہ اس عورت کا بھائی یا باپ نہیں تھا لیکن بھائیوں اور باپ سے زیادہ دل چسپی ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے میرے شک کو تقویت مل رہی تھی۔

بہر حال یہ ثابت ہو گیا تھا کہ گمشدہ لڑکی کا میجر کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کرنل جانسن کا نام بھی سامنے آیا تھا۔ میں نے تھانے میں جا کر اس مسلمان میجر کے پیچھے مخبر لگا دیئے اور اُس کے ساتھ اُس کے بنگلے میں ملنے کا بندوبست کر لیا۔ ملاقات رات کو ہوئی۔ اس نے مجھے شراب پیش کی۔ میں نے بوتل اور گلاس اُٹھا کر پرے رکھ دیئے اور کہا کہ میں تفتیش کے لیے آیا ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ہوش میں رہیں۔ میں نے ہندو ٹھیکیدار کا نام لے کر کہا کہ اُس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے۔ آپ کے ساتھ لڑکی کے گہرے مراسم تھے۔ آخری بار وہ آپ کے ساتھ دیکھی گئی تھی۔

"کب؟"

"آپ صرف جواب دیں" — میں نے کہا — "میں ابھی آپ کے

کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔"

"یہ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میں برٹش انڈیا آرمی کا میجر ہوں" اُس نے کہا — "میں سڑکوں پر پھرنے والا جیب کترا نہیں ہوں۔"

"اور جناب کو یہ علم ہو گا ہی کہ یہ خادم برٹش انڈیا پولیس کا انسپکٹر ہے۔" میں نے کہا — "ملٹری پولیس کا حوالدار نہیں ہے۔" — پھر میں نے آہستگی سے کہا — "میجر صاحب! میں آپ کو تھانے میں بلوا سکتا ہوں۔ آپ کو افسر اور اپنا مسلمان بھائی سمجھ کر آپ کی عزت افزائی کی ہے کہ آپ کے گھر میں آ گیا ہوں۔ کرم کریں اور جتنی دیر میں یہاں بیٹھا ہوں، اپنے آپ کو میجر سمجھنا چھوڑ دیں۔ اس میں آپ کا اپنا بھلا ہے۔"

مگر وہ اپنے عہدے کو ذہن سے اتارنے پر آمادہ نہیں تھا۔ کہنے لگا — "کیا آپ یہ سمجھ کر آئے ہیں کہ اس لڑکی کو میں نے کہیں غائب کر دیا ہے؟"

"جی نہیں" — میں نے اُسے نرم کرنے کے لیے کہا — "میں یہ ثابت کرنے آیا ہوں کہ آپ نے لڑکی کو غائب نہیں کیا۔ اس ثبوت کے لیے مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ لڑکی بالغ ہے، اگر وہ آپ کے پاس ہے یا کسی اور کے پاس، وہ کورٹ میں جا کر بیان دے سکتی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اُس کے ساتھ گئی ہے۔ قانون اُس آدمی کا یا آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔"

"پھر آپ تفتیش کیوں کر رہے ہیں؟"— اُس نے پوچھا۔

"اُس کے باپ نے رپورٹ درج کرائی ہے"— میں نے جواب دیا— "مجھے لڑکی برآمد کرنی ہے۔ لڑکی پہلے دن ہی کورٹ میں بیان دے گی تو مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ مجھے صرف یہ بتا دیں کہ لڑکی کہاں ہے؟"

"مجھے کچھ پتہ نہیں"— اس نے جواب دیا۔

"آپ کو کب معلوم ہوا تھا کہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے؟"— میں نے پوچھا۔

"پرسوں"— اُس نے جواب دیا— "ٹھیکیدار نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ لڑکی واپس کر دو ورنہ تمہیں گرفتار کرا دوں گا۔ آپ غالباً اُسی کے کہے پر میرے پاس آئے ہیں۔"

"اُس نے آپ پر شک کیوں کیا ہے؟"— میں نے پوچھا۔

"اس لیے کہ میں نے اُس کا ایک بل روکا ہوا ہے"— میجر نے جواب دیا— "بل ستاون ہزار کا ہونا چاہیئے لیکن اُس نے اٹھانوے ہزار کا بل بنایا ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ بل ستاون ہزار کا بناؤ۔ میں نے بل روک لیا ہے۔"

"کیا ہر ٹھیکیدار کا ہر بل صحیح ہوتا ہے؟"

"یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں"— اس نے جواب دیا— "کہ ہمارے محکمے میں رشوت خوری حد سے زیادہ ہے۔ کبھی کوئی بل صحیح نہیں آتا۔ بل پاس کرنے والے افسر اور کلرک اپنا اپنا حصہ لے لیتے ہیں لیکن ستاون ہزار کا بل ساٹھ ہزار یا اس سے کچھ اوپر کا بھی بن سکتا ہے اور ادا بھی ہو سکتا ہے۔

اکٹھے اکتالیس ہزار کا فرق کیسے ہضم کیا جائے؟ اب اتفاق سے اُس کی بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے۔ اُس نے انتقام لینے کے لیے یا مجھے ڈرانے کے لیے میرے خلاف شک کا اظہار کر دیا ہے اور مجھ تک پیغام بھی پہنچایا ہے کہ تمہیں گرفتار کرا دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس لڑکی کے ساتھ میرا کوئی ایسا گہرا تعلق نہیں ہے۔ میں شادی شدہ ہوں۔"

"آپ کے بیوی بچے کہاں ہیں؟"

"چند دنوں کے لیے اپنے گھر گئے ہوئے ہیں۔"

"کب گئے ہیں؟"

"انسپکٹر صاحب!"— اُس نے قدرے مسکرا کر کہا— "میرا خیال ہے کہ میری فیملی کے ساتھ اس ہندو لڑکی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسے میں بالکل ضروری نہیں سمجھتا کہ آپ میرے گھریلو معاملات میں دخل دیں۔"

"میجر صاحب!"— میں نے اُسے کہا— "آپ نے اپنے لیے مشکل پیدا کر رکھی ہے کہ اس لڑکی کا آپ کے گھریلو معاملات میں گہرا دخل ہے۔ میں تفتیش کر رہا ہوں۔ بڑا لمبا چکر کاٹ کر آپ تک پہنچا ہوں۔ بات اتنی سی ہے کہ اگر لڑکی آپ کے پاس ہے تو بتا دیں۔ بہتر طریقہ یہ ہے کہ اُسے کورٹ میں لے جائیں اور اُس کے بیان ریکارڈ کروا دیں کہ وہ بالغ ہے اور اپنی مرضی سے آپ کے ساتھ آئی ہے۔ پھر آپ چاہیں تو اُس کے ساتھ شادی کر لیں، چاہیں تو واپس کر دیں۔ یہ کوئی جرم نہیں ہے۔"

بیوی نے بے وفائی نہیں کی

لیکن یہ میجر کوئی بھی بات تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اُسے میری باتوں سے یہ بھی شک نہ ہُوا کہ میں اس کے اور لڑکی کے تعلقات کے متعلق بہت کچھ جان چکا ہوں۔ اس کے روّیے سے مجھے شک ہونے لگا

اُس نے پھر بل کی بات کی۔ کہنے لگا — "پولیس کو صرف اس بل کی وصولی کے لیے میرے پیچھے ڈالا گیا ہے۔ لڑکی کو میں جانتا ہوں۔ وہ اتنی کچّی نہیں کہ اُسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہوگا۔ وہ گُم نہیں ہوسکتی۔ کسی نئے دوست کے ساتھ سیر سپاٹے کے لیے چلی گئی ہوگی۔"

اُس کے انداز میں لاپرواہی اور بے نیازی سی تھی جیسے مجھے کوئی اہمیّت نہیں دے رہا۔ میں نے اس کے گرد مخبروں کا جال پھیلا دیا تھا، اس لیے بہتر یہ سمجھا کہ اس پر بم پھینک دیے جائیں تاکہ میرے مخبر اس کا ردِّعمل دیکھیں اور نظر رکھیں کہ وہ کہاں کہاں جاتا ہے۔ میں نے اُس کے ساتھ بہت باتیں کیں اور جب دیکھا کہ وہ کسی بات پر نہیں آرہا تو میں نے پوچھا — "میجر صاحب! مجھے صرف یہ بتا دیں کہ آپ اس لڑکی کے تعلقات سے دست بردار ہونے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟"

"کیونکہ میرا اس کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں ہے" — اُس نے

دو ٹوک جواب دیا۔

"تو پھر یوں کہہ دیں کہ وہ آپ کے گھر کرنل جانسن کے ساتھ بدکاری کرنے کے لیے آیا کرتی تھی" — میں نے کہا۔

"کون کرنل جانسن؟" — اُس نے پوچھا لیکن اُس کی زبان کچھ ہکلا گئی تھی۔

"وہ کرنل جانسن جس نے آپ کی شریف اور وفادار بیوی کو بُری نیّت سے پھانسنے کی کوشش کی تھی" — میں نے کہا — "کیا میں آپ کو آپ کے بنگلے کے اُس کمرے میں لے چلوں جہاں آپ اور کرنل جانسن اُس لڑکی کے ساتھ بدکاری کیا کرتے تھے؟"

وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میرے محترم دوست! آپ کے بنگلے کے جو درخت ہیں وہ بھی پولیس کے انفارمر (مخبر) ہیں۔ میں آپ کے پاس خالی ذہن لے کر نہیں آیا..... اُس لڑکی کو کہیں چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ بالغ اور آزاد خیال لڑکی ہے۔ آپ کسی بھی وقت اُس کے ساتھ شادی کر سکتے ہیں۔ اپنی بیوی کو آپ بلا وجہ طلاق دے سکتے ہیں۔"

"بلا وجہ نہیں" — وہ تو جیسے مر ہی گیا تھا۔ مری ہوئی آواز میں بولا — "میں نے اپنی بیوی کو بلا وجہ گھر نہیں بھیجا۔ اس کے ایک آدمی کے ساتھ ناجائز تعلّقات ہیں۔ اُسے گھر بھیجنے کا لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ کوئی تعلّق نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ لڑکی

کہاں ہے۔ آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ لڑکی کے باپ نے مجھ پر کیوں شک کیا ہے۔"

"کیا آپ اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہتے ہیں؟"

"میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

"اب میں آپ سے جو بات کرنے لگا ہوں، یہ پولیس انسپکٹر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے کروں گا"— میں نے اسے خلوصِ دل سے کہا— "اگر میں ثابت کر دوں کہ آپ کی بیوی نے ارشد کو ساتھ ملا کر محض ناٹک کھیلا ہے تو آپ اپنی بیوی کو واپس لے آئیں گے؟"

"کیسا ناٹک؟"

"آپ کی بیوی آپ کو شراب خوری اور بدکاری سے ہٹانے کے لیے آپ کو یہ دکھانا چاہتی تھی کہ آپ بدکار ہو سکتے ہیں تو میں بھی ہو سکتی ہوں"— میں نے اسے بتایا— "آپ کی بیوی نے آپ کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔"

اس نے کچھ حیرت زدہ سا ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا— "کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ ہندو لڑکی آپ کے ساتھ وفا کرے گی؟ کسی بھی وقت یہ ہندو آپ کو رشوت کے الزام میں پکڑوا کر آپ کی زندگی اور حیثیت تباہ کر سکتے ہیں۔"

"مجھ سے قسم لے لیں"— اس نے برخورداروں کی طرح کہا—

"میں اس لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کروں گا۔ وہ بدکار ہے، دولت زیورات اور نہایت اعلیٰ لباس کا اسے نشہ ہے۔ میں ایسی لڑکی کے ساتھ کیسے شادی کر سکتا ہوں جسے شادی کی ضرورت ہی نہیں اور جو انگریز، ہندو اور مسلمان افسروں کی مشترکہ بیوی بنی ہوئی ہے؟ میرے بھی اس کے ساتھ تعلقات ہیں لیکن میں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ اس کی خاطر اپنی بیوی اور اپنے دو ننھے ننھے بچوں سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر۔۔۔۔" وہ رک رک کر بولا— "مگر آپ نے ایک نئی بات بتائی ہے۔ میری بیوی نے ارشد کے ساتھ مل کر مجھے سبق دینے کی کوشش کی ہے۔ مجھے اس کے متعلق سوچنے دیں۔ میری بیوی مجھے دھوکہ نہیں دے سکتی۔ اس نے ضرور ڈرامہ کھیلا ہے۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے ایک مسلمان گھرانہ آباد کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ کامیاب ہو رہی تھی اور مجھے یہ یقین بھی آنے لگا تھا کہ لڑکی کی گمشدگی کے ساتھ اس میجر کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی میں نے مخبروں کو وہاں سے نہیں ہٹایا۔ میں نے میجر سے کرنل جانسن کے بنگلے کا نمبر پوچھا۔ اس نے فوراً بتا دیا۔

میرا خیال تھا کہ یہ انگریز کرنل بھی ایم۔ای۔ایس کا ہو گا لیکن میجر نے بتایا کہ وہ ٹینک رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر ہے۔ میں اس کے بنگلے میں گیا۔ وہاں اس کا خانساماں ملا۔ اس نے بتایا کہ کرنل سات روز کی چھٹی گیا ہوا ہے۔ روانگی کی تاریخ پوچھی تو یہ وہی تاریخ تھی

جس روز ہندو لڑکی (اپنے باپ کے بیان کے مطابق) لاپتہ ہوئی تھی۔ مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ لڑکی اسی کے ساتھ گئی ہے۔ خانساماں نے بتایا کہ وہ ڈلہوزی گیا ہے۔ ڈلہوزی ہندوستان کا ایک پہاڑی صحت افزا مقام ہے۔ مری سے زیادہ بلند اور خوبصورت۔ میں نے خانساماں کو سختی سے کہا کہ میں اس سے جو کچھ پوچھوں اُس کا ذکر وہ صاحب سے نہ کرے۔ یہ لوگ پولیس سے بہت ڈرتے تھے، کیونکہ پولیس کسی بھی وقت کسی بھی ملازم کے خلاف رپورٹ دے کر کہ اس کا چال چلن اچھا نہیں نوکری سے الگ کرا سکتی تھی۔ خانساماں کو میں نے ہندو لڑکی کی دونوں تصویریں دکھا کر پوچھا کہ اُس نے اس لڑکی کو کبھی دیکھا ہے؟

"بہت دفعہ دیکھا ہے حضور!" — اُس نے جواب دیا — "صاحب کے پاس آتی رہتی ہے۔"

"آخری بار کب آئی تھی؟"

"صاحب جس روز چھٹی گیا اُس سے ایک روز پہلے آئی تھی۔" — اُس نے جواب دیا۔

"اکیلی آتی تھی؟"

"کبھی اکیلی آتی ہے اور کبھی ایم۔ای۔ایس کا ایک انڈین میجر ساتھ ہوتا ہے۔"

"کرنل صاحب کی میم صاحب ہیں؟"

"نہیں حضور!" — خانساماں نے جواب دیا — "کرنل صاحب اکیلا رہتا ہے۔ اس کی میم صاحب ولایت میں ہے۔"

انٹیلی جنس کا صوبیدار اور ہندو لڑکی

میں خانساماں کو منہ بند رکھنے کی تنبیہہ کر کے تھانے گیا۔ کرنل کو تیسرے روز واپس آنا تھا۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ لڑکی اسی کرنل کے ساتھ ڈلہوزی گئی ہے اور اُس کے ساتھ واپس آجائے گی۔ میری مجبوری یہ تھی کہ لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ رجسٹر کرائی گئی تھی۔ مجھے لڑکی کا سراغ لگانا تھا ورنہ یہ کوئی واردات نہیں تھی۔

شام کو لڑکی کا باپ آگیا۔ پوچھنے لگا کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے؟

میں نے اُسے کہا — "جناب لالہ صاحب! مجھے صرف یہ بتا دیں کہ آپ نے اس میجر پر کیوں شک کیا ہے؟ کرنل جانسن پر کیوں نہ کیا؟ ان افسروں پر کیوں نہ کیا جن کے ساتھ آپ کی بیٹی شامیں گزارتی ہے؟ کیا آپ میجر کو مشتبہ لکھوا کر اور اُسے گرفتاری کی دھمکی دے کر اُس سے اٹھانوے ہزار روپے کا وہ بل منظور کرا سکتے ہیں جو دراصل ستاون ہزار کا ہونا چاہیئے؟ آپ نے اُن تمام ہندو، انگریز اور اینگلو انڈین افسروں کو مشتبہ کیوں نہیں کہا جن کے ساتھ آپ کی بیٹی

کے تعلقات ہیں؟"

"میں نے یقین کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ میجر کے ساتھ ہی گئی
ہے" اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں نے یہ کہا تھا کہ اُس
کے ساتھ اس کے تعلقات گہرے ہیں"

"مجھے یہ بھی شک ہے کہ لڑکی کو آپ نے کہیں چھپا دیا ہے اور
میجر سے بل پاس کروانے کے لیے اُسے پھانس رہے ہیں"

میں دراصل یہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ گھبرا کر کیس واپس لے لے
مگر وہ ہندو تھا۔ ہندو میں یہ وصف ہوتا ہے کہ آپ کے پاؤں
سر رکھ دے گا لیکن اپنی ہٹ سے باز نہیں آئے گا۔ یہی مظاہرہ
ہندو نے کیا۔ گھبراہٹ سے اس کی زبان کانپ رہی تھی۔ وہ ہا
بھی جوڑ رہا تھا مگر مسلمان میجر کا ہی نام لیے جا رہا تھا۔ مجھے توقع
تھی کہ مجھ پہ وہ الزام عائد کرے گا کہ میں مسلمان ہوں اس لیے مسلما
میجر کو بچانا چاہتا ہوں لیکن اُس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

کرنل جانسن کے واپس آنے میں دو دن باقی تھے۔ میں نے اس
کیس کو الگ رکھ دیا اور قتل کے ایک کیس میں مصروف ہو گیا۔

دو دن گزر گئے۔

میں شام کے وقت کرنل جانسن کے بنگلے پر گیا۔ وہ بڑے ا
انداز سے ملا۔ میں نے اُسے ہندو لڑکی کی تصویریں دکھا کر پوچھا کہ وہ
جانتا ہے یا نہیں؟ اُس نے صاف انکار کر دیا اور پوچھا کہ کیا با

ہے۔ میں نے بتایا کہ یہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے۔ اس کے باپ نے
پولیس سٹیشن میں رپورٹ درج کرائی ہے اور میں ہر اُس شخص
سے پوچھتا پھر رہا ہوں جہاں یہ لڑکی جایا کرتی تھی۔

کرنل نے مجھ سے پوچھا —— "تمہیں کس نے بتایا ہے کہ وہ
میرے پاس آیا کرتی تھی؟"

"میں پولیس انسپکٹر ہوں" —— میں نے اُسے کہا —— "میں
ایسی بات آپ کو کبھی نہیں بتا سکتا کہ کس نے مجھے کیا بتایا ہے۔
میں آپ کے پاس بلا وجہ نہیں آیا"

کرنل کہیں باہر جا رہا تھا۔ اُس نے وردی پہن رکھی تھی۔ وہ
دو باتیں کہہ کر چلا گیا۔ ایک یہ کہ وہ بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کانفرنس میں
جا رہا ہے اور دوسری یہ کہ اگر میں اُسے تفتیش میں شامل کرنا
چاہتا ہوں تو مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینی پڑے گی۔
وہ مجھے اپنے بنگلے کے برآمدے میں چھوڑ کر چلا گیا۔ اُس کا
اردلی آ گیا۔

ان حضرات کے لیے جو فوجی اُمور سے واقف نہیں، میں یہ
وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ ہر فوجی افسر کو ایک سپاہی اردلی
کے طور پر ملا ہوا ہوتا ہے۔ اسی طرح کرنل جانسن کے بنگلے میں بھی
ایک اردلی تھا۔ مجھے برآمدے میں کھڑا دیکھ کر وہ آ گیا۔ میں وہاں
کھڑا سوچ رہا تھا کہ ایک انگریز کرنل کو تفتیش میں شامل کر کے اس

سے کس طرح کام کی باتیں اگلواؤں گا۔ انگریز ہمارے بادشاہ تھے یہ کرنل ملانز اچھے طریقے سے تھا لیکن میرے سوالوں کا جواب شاہانہ بے رخی سے دیا اور چلا گیا۔ یہ تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔

اردلی نے آکر مجھے سہارا دیا۔ اُس نے میرے ساتھ اُردو میں بات کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ پنجابی ہے۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کس کام سے آیا ہوں میں نے اُسے پنجابی زبان میں جواب دیا اور اس سے تعاون کی درخواست کی۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اردلی صاحب کا کوئی راز مجھے بتائے گا۔ یہ لوگ انگریز افسروں کے زرخرید غلام ہوتے تھے۔ انگریزوں کی خوشنودی کی خاطر اپنوں کا گلا کاٹنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ تاہم میں نے اُسے بتا دیا کہ میں کیوں آیا ہوں۔ اُسے ہندو لڑکی کی تصویریں دکھا کر پوچھا کہ یہ لڑکی یہاں کبھی آئی ہے؟ اُس نے بتایا کہ کئی بار آئی ہے۔

ہندوستان میں ہم دُور پنجابی بغلگیر ہو کر ملا کرتے تھے کیونکہ ہمارے لیے پردیس تھا۔ اس ادھیڑ عمر اردلی نے مجھے سرونٹ کوارٹر میں چلنے اور چائے پانی کی دعوت دی جو میں نے بصد شکریہ ٹال دی۔ اردلی سے کہا کہ وہ میری مدد کرے اور رات کو کام سے فارغ ہو کر تھانے میں آجائے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ایک دو باتیں پوچھنی ہیں۔ اُس نے کہا کہ چوری چھپے آنا پڑے گا کیونکہ تفتیش کے لیے سوال میں کسی بھی کام کے لیے جانا ہو تو اجازت لینی پڑتی ہے۔"

نے اُسے یقین دلایا کہ میں اُسے گواہوں میں شامل نہیں کروں گا۔

وہ پنجابی ہونے کی وجہ سے اور میرے دوستانہ رویّے سے متاثر ہو کر رات تھانے میں آنے پر رضامند ہو گیا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ سپاہی اَن پڑھ نہیں ہو سکتا۔ سلجھی ہوئی باتیں کرتا تھا اور اس کے انداز میں خود اعتمادی اور وقار سا تھا۔ اردلی عموماً اُس سپاہی کو بنایا جاتا تھا جو فوجی لحاظ سے نکمّا اور نالائق ہو۔ یہ نالائق نہیں لگتا تھا۔ میں نے سوچا کہ کرنل نے اپنے لیے ذہین اور ہوشیار سپاہی منتخب کیا ہے۔

رات دس بجے کے قریب اردلی آگیا۔ مجھے اس کا اصلی نام چھپانے کی ضرورت نہیں۔ وہ تحصیل چکوال کے کسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام محمد خان تھا۔ وہ میرے پاس آیا تو مجھ سے پوچھا کہ یہ کیس کیا ہے؟ میں نے مختصراً بتا دیا۔ اُس نے مجھ پر ایک سوال کیا پھر دوسرا سوال کیا اور پھر وہ مجھ سے اسی انداز سے سوال پر سوال کرتا گیا جیسے میں نہیں بلکہ وہ پولیس انسپکٹر ہے اور کسی واردات کی تفتیش کے لیے مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آیا ہے۔

میں نے جھنجھلا کر کہا — "گرائیں! میں نے تم سے کچھ پوچھنے کے لیے تمہیں بلایا تھا مگر تم نے مجھے ملزم سمجھ لیا ہے۔ میں تفتیش کر رہا ہوں۔"

"میں بھی تفتیش کر رہا ہوں" — اُس نے مسکرا کر کہا — "میں

سپاہی نہیں ہوں۔ میں ملٹری انٹیلی جنس (جاسوسی اور سراغرسانی کے محکمے) کا صوبیدار ہوں۔ کرنل جانسن کو میری اصلیت کا علم نہیں۔ رجمنٹ کے سیکنڈ اِن کمانڈ اور ایجوٹنٹ کے سوا میری اصلیت کا کسی کو بھی علم نہیں۔ آپ ہندو لڑکی کی گمشدگی کو اغوا کا کیس سمجھتے ہوں گے لیکن مجھے شک ہے کہ یہ معمولی سا کیس نہیں ہے۔ یہ مجھے اُس کیس کی کڑی معلوم ہوتی ہے جس کی سراغرسانی کے لیے مجھے اس کرنل کا اردلی بنایا گیا ہے۔ اس کے متعلق شک ہے کہ یہ جاسوس ہے۔ مجھے اس کے بنگلے میں یہ خبر دینے کے لیے اردلی لگایا گیا ہے کہ کیا یہ واقعی جاسوس ہے؟ اور اگر جاسوس ہے تو جاپان کا ہے یا جرمنی کا؟ میری ڈیوٹی یہ ہے کہ دیکھتا رہوں کہ بنگلے میں آکر کیا کرتا ہے، کہاں جاتا ہے اور اِس کے پاس سول کا کون کون آدمی آتا ہے....

"میں نے اب تک جو رپورٹیں دی ہیں ان سے اس کرنل کو جاسوس ثابت کرنا ممکن نہیں۔ اس کے پاس اپنی یونٹ کے افسروں کے علاوہ ایم۔ ای۔ ایس کا ایک مسلمان میجر آتا ہے اور یہ ہندو لڑکی آتی ہے۔ میں ان دونوں کی رپورٹ دے چکا ہوں مگر میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ وہ بند کمرے میں کیا کرتے ہیں۔ اندر وسکی جاتی ہے جو میں ہی لے کے جاتا ہوں لیکن شک والی کوئی حرکت نظر نہیں آتی۔ اب آپ نے بتایا ہے کہ یہ لڑکی لاپتہ ہو گئی ہے۔

ادھر کرنل جانسن اُسی روز چھٹی گیا جس روز آپ بتاتے ہیں کہ لڑکی غائب ہوئی۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ لڑکی اسی کے ساتھ گئی تھی اور یہ عیاشی اور بدکاری کا معاملہ نہیں ہے۔ میں نے ملٹری انٹیلی جنس کی ٹریننگ انگریزوں سے لی ہے۔ بال کی کھال اتار کر آپ کو اندر کا حال بتا سکتا ہوں۔ یہ لڑکی آپ نے دیکھی نہیں۔ آپ نے بڑی بڑی خوبصورت لڑکیاں دیکھی ہوں گی مگر اس لڑکی کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں ایسا جادو ہے کہ آپ کے سامنے آئے تو آپ اُس کے پاؤں میں بیٹھ کر پوچھیں گے کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ ایسی لڑکیاں جاسوسی کے لیے فِٹ ہوتی ہیں۔ جاپانی اور جرمن اس قسم کی ہندوستانی لڑکیوں کو جاسوسی کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔"

انگریز کرنل اور ہندو لڑکی کی منزل ایک تھی

میں سارا معاملہ سمجھ گیا۔ ایک انگریز کرنل کا جاسوس ہونا کوئی حیرت والی بات نہیں تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران متعدد انگریز فوجی افسر پکڑے گئے تھے جو جرمنوں کے جاسوس تھے۔ ان میں سے زیادہ تر تو جرمن تھے جو پہلی جنگِ عظیم کے فوراً بعد انگریزوں کے بہروپ میں انگلینڈ چلے گئے اور فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جرمنی کو شکست ہوئی تھی شکست

کو فتح میں بدلنے کے لیے جرمنی کی حکومت نے اُسی وقت اپنے جاسوس یورپ اور انگلینڈ میں پھیلا دیئے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم تک جرمنی کے اُن جاسوسوں کو جو انگریزوں کی فوج میں افسر بن چکے تھے انگریز ہی سمجھا جاتا تھا۔ جنگ کے دوران ان جاسوسوں نے اپنے کمالات دکھائے اور ابتدا میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کی شکستِ فاش کا باعث بنے۔

یہ کرنل انہی جاسوسوں میں سے ہو سکتا تھا لیکن جاسوس کو عین موقعہ پر گرفتار کرنا ناممکن ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جاسوس اپنا کام نہایت خوبی سے ڈھکے چھپے طریقے سے کرتے ہیں۔ اگر ان پر شک کا اظہار کیا جائے تو وہ بچنے کے طریقے جانتے ہیں۔ انہیں صرف شک میں پکڑ لیا جائے تو اس کے دو نقصان ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ عدالت میں اُن کے خلاف الزام ثابت نہیں کیا جا سکتا اور دوسرا یہ کہ ان کی پارٹی کے دوسرے جاسوس چوکنے ہو کر ثبوت اور شہادت غائب کر دیتے ہیں۔ جاسوس بظاہر اکیلے اکیلے ہوتے ہیں لیکن ان کی ایک پارٹی ہوتی ہے۔ ہر پارٹی کے جاسوس اپنے مشن کے مطابق پھیل جاتے ہیں اور ایک دوسرے سے رابطہ بھی رکھتے ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک پارٹی کا ایک جاسوس کلکتہ میں ہوتا ہے اور دوسرا پشاور میں۔ تیسرا مدراس میں اور چوتھا سرینگر میں۔ جاسوسی کے لیے مقامی

لڑکیاں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔

کرنل جانسن ایک رسالے کا کمانڈنگ آفیسر تھا۔ رسالے میں گھوڑے ہوا کرتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم میں گھوڑوں کی جگہ بکتر بند گاڑیاں اور ٹینک آ گئے تھے۔ کرنل جانسن کے رسالے کے گھوڑے واپس لے لیے گئے تھے اور اب اُسے ٹینک دیئے جا رہے تھے۔ صوبیدار محمد خان ذہین اور ہوشیار آدمی تھا۔ دس جماعتیں پاس تھا۔ انگریزی روانی سے بول سکتا تھا۔ وہ اردلی سپاہی کا رول خوش اسلوبی سے ادا کر رہا تھا۔ اس نے جب مجھے کرنل جانسن کے خلاف جاسوسی کا شک بتایا اور ہندو لڑکی پر بھی شک کا اظہار کیا تو مجھے خوشی ہوئی کہ بیکار سے ایک کیس سے جان چھڑانے کا بہانہ مل گیا ہے۔ میں نے محمد خان سے کہا کہ مجھے ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں لے چلے تاکہ میں یہ کیس ان کے حوالے کر دوں۔

محمد خان نے ایسا کرنے سے روک دیا اور کہا ـــــ "میری ترقی کا دارومدار اس کیس پر ہے۔ اگر میں ثابت کر دوں کہ کرنل جانسن ایم۔ ای۔ ایس کا میجر اور یہ ہندو لڑکی جاسوس ہیں تو مجھے ملٹری انٹیلی جنس کا ماہر سراغرساں تسلیم کر لیا جائے گا۔ ترقی بھی ملے گی اور ہو سکتا ہے انعام بھی مل جائے۔" اُس نے مجھے مشورہ دیا ـــ "آپ اس کیس سے دست بردار ہونے کی کوشش نہ کریں۔ اگر ہم دونوں مل کر ان دونوں کے خلاف شہادت مہیا کر دیں تو اس میں آپ کو

بہت فائدہ ملے گا۔ انعام کی توقع بھی رکھی جاسکتی ہے۔"

میں نے اس کا مشورہ مان لیا۔ اس میں انعام کا لالچ بھی تھا، لیکن صوبیدار محمد خان نے جس طرح میرے ساتھ تعاون کیا تھا میں اس کا صلہ دینا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اپنے علاقے کا آدمی ہے اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے تو اس کی مدد کیوں نہ کروں۔ میرے لیے مشکل یہ تھی کہ ملٹری انٹیلی جنس میری لائن نہیں تھی۔ جاسوس، چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ غیر معمولی طور پر ہوشیار اور ذہین ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف شہادت حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ انٹیلی جنس کی ٹیکنیک ہی مختلف ہوتی ہے۔ تاہم میں نے فیصلہ کیا کہ کچھ اپنی عقل سے کام لوں گا کچھ صوبیدار سے رہنمائی لوں گا اور اس کیس کو چھوڑوں گا نہیں۔

میں نے محمد خان سے کہا کہ وہ اپنے ہیڈ کوارٹر میں میری تفتیش کی اطلاع دے دے۔ اسے میں نے دوسرا مشورہ یہ دیا کہ کرنل جانسن کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرو اور صرف ان پڑھ اردلی نہ بنے رہو۔ اس کی ذاتی کمزوریوں کو استعمال کرنے کی کوشش کرو۔

محمد خان بہت ہی دانشمند آدمی تھا۔ اس نے کہا کہ کرنل جانسن کو ہندوستان میں آئے چار سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ یہ اکیلا رہتا ہے۔ شاید اس کی بیوی ہے ہی نہیں۔ اس کی ایک کمزوری

تو یہی ہے کہ اس کی بیوی یہاں نہیں ہے۔ اس کے زیرِ اثر کرنل جانسن تنہائی بھی محسوس کرتا ہوگا۔ اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔

رات کو ہی صوبیدار محمد خان ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر میں گیا اور میری تفتیش کی رپورٹ دے دی۔ دوسری صبح مجھے وہاں سے بلاوا آیا۔ میں نے تمام تفصیلات بتا دیں۔ ایک انگریز کرنل نے مجھ پر بے شمار سوال داغے۔ وہ شاید مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں اس کیس کو سنبھال سکوں گا۔ میں نے اسے تسلّی دی اور محمد خان کی ذہانت کی بھی تعریف کر دی۔ اس کرنل نے مجھے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے تحریری اجازت نامہ دے دیا کہ میں کرنل جانسن اور مسلمان میجر (جس کا میں نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا) کے سرکاری کاغذات کسی بھی وقت دیکھ سکتا ہوں اور ان سے کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ پوچھ گچھ کر سکتا ہوں۔

میں نے کرنل جانسن کی غیر حاضری میں اس کے دفتر سے جا کر معلوم کیا کہ وہ چھٹی گزارنے کے لیے کہاں گیا تھا۔ وہاں ڈلہوزی لکھا ہوا تھا۔ یہ چونکہ جنگ کا زمانہ تھا اس لیے فوجی افسر جہاں چھٹی جاتے تھے وہاں کا پورا ایڈریس دے جاتے تھے۔ کرنل جانسن نے یہ ایڈریس دیا تھا —— "معرفت پوسٹ ماسٹر ڈلہوزی"۔

میں ریلوے سٹیشن گیا۔ وہاں سے معلوم کیا کہ فلاں تاریخ کو

کرنل جانسن کی فسٹ کلاس سیٹ کون سی گاڑی میں بُک ہوئی اور کہاں تک ہوئی تھی۔ اِن کے پاس ریکارڈ موجود تھا۔ جس سٹیشن تک اُس کی سیٹ بُک ہوئی، اس کا ڈلہوزی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر وہ ڈلہوزی ہی گیا تھا تو وہ اسی چھاؤنی سے موٹر ٹرانسپورٹ پر گیا ہوگا مگر جس سٹیشن تک اُس کی سیٹ بُک ہوئی تھی وہاں سے کوئی موٹر ٹرانسپورٹ ڈلہوزی نہیں جاتی تھی۔

ریلوے سٹیشن کے اسی ریکارڈ کو پھر دیکھا۔ میں اس ہندو لڑکی کا نام تلاش کر رہا تھا۔ کرنل جانسن کی روانگی سے ایک روز پہلے ایک عورت کے نام سے فسٹ کلاس کی ایک سیٹ بک ہوئی تھی مگر نام کچھ اور تھا۔ میں نے متعلقہ بابو سے پوچھا کہ کیا وہ اس عورت کو پہچان سکے گا؟ فسٹ کلاس کے مسافر زیادہ تر فوجی افسر ہوا کرتے تھے۔ امیر کبیر شہری انٹر یا سیکنڈ میں سفر کیا کرتے تھے۔

بابو نے مسکرا کر کہا — "بدتمیزی کی معافی چاہتا ہوں۔ اس عورت کو کوئی دیکھ لے تو ساری عمر نہیں بھولے گا۔"

میں نے دونوں تصویریں (ہندو لڑکی کی) اُس کے آگے رکھ دیں۔ بابو نے بدتمیزی کی معافی تو مانگ لی تھی لیکن بدتمیزی سے باز نہ آیا۔ دونوں تصویریں ہاتھ میں لے کر فلموں کے مسخروں کی طرح بولا — "ہائے خدائے حضور! یہی تھی۔ یہ ہے کون حضور؟"

اُس کی بکنگ بھی اسی سٹیشن تک تھی جہاں اگلے روز کرنل جانسن گیا تھا۔

کرنل گھبرا گیا

میں اپنی سوچی ہوئی لائن کے مطابق مسلمان میجر کے بنگلے پر چلا گیا۔ اُس کے متعلق مخبروں نے کوئی ایسی رپورٹ نہیں دی تھی جو میرے کام آ سکتی سوائے اس کے کہ وہ ایک شام پنشنر کرنل جانسن کے پاس گیا تھا۔ وہ زیادہ تر دفتر سے آ کر بنگلے میں ہی رہا۔

میں میجر سے ملا تو اُس نے پہلا سوال یہ کیا — "لڑکی کا کچھ پتہ چلا؟"

میں نے اُسے کہا — "یہی سوال میں آپ سے پوچھنے آیا ہوں۔"

اُس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ میں نے دھیمی سی آواز میں رازداری کے لہجے میں اس سے پوچھا — "لڑکی کب واپس آ رہی ہے؟ وہ واپس آئے گی یا نہیں؟"

"آپ نے پھر وہی رٹ شروع کر دی ہے" — میجر نے کہا۔ "اُس روز آپ مان گئے تھے کہ لڑکی کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"اُس روز اِس کیس کی صورت کچھ اور تھی" — میں نے کہا۔ "آج کچھ اور ہے" — وہ کچھ کہنے ہی لگا تھا، میں نے اُسے بولنے

نہ دیا اور کہا ـــ "سنو میجر صاحب! میری نیت اور میرے خلوص کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ پیشتر اس کے کہ میں تمہیں گرفتار کروں، میں مسلمان کی حیثیت سے تمہاری بیوی اور دو معصوم بچوں کا خیال کرتے ہوئے یہ موقعہ دیتا ہوں کہ اقبال جرم کرلو۔ میں تمہیں سلطانی گواہ بنالوں گا۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد تم سروس میں نہ رہ سکو لیکن بڑی لمبی قید سے بچ جاؤ گے اور شاید۔۔۔۔" میں نے آگے جھک کر کہا ـــ "شاید سزائے موت سے بچ جاؤ۔ بہرحال تم جیل تک نہیں جاؤ گے۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی اور اُس کا رنگ پیلا پڑگیا۔ سوچ میں کھو گیا۔ میں خاموش بیٹھا رہا۔ وہ اتنی دیر میں سنبھل گیا اور بولا۔ "کیا ایسی لڑکی کی گمشدگی مجھے پھانسی کے تختے تک پہنچا سکتی ہے جبکہ میں صرف اتنا ہی جانتا ہوں کہ امیر کبیر اور گریجویٹ سوسائٹی گرل ہے؟"

"وہ اس سے زیادہ بھی کچھ ہے" ـــ میں نے کہا۔

"اس سے آگے میں کچھ نہیں جانتا" ـــ اس نے کہا ـــ "آپ جو کارروائی کرنا چاہتے ہیں کرلیں۔"

"میں تمہیں سوچنے کا موقعہ دیتا ہوں۔" میں نے کہا اور اُس کے بنگلے سے نکل آیا۔

میں نے اُسے سوچنے کا موقعہ دے دیا تھا لیکن میں خود اِس

سوچ میں پڑ گیا کہ کیا یہ میجر جاسوسی کا مجرم ہے؟ صوبیدار محمد خان نے، ریلوے ریکارڈ نے اور لڑکی کے فرضی نام سے باہر جانے نے مجھے یقین دلا دیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے مگر کیا میجر بھی اس رنگ کا ممبر ہے؟ تاہم میں نے اُسے آگ لگا دی تھی۔ اب میرے مخبروں کو یہ دیکھنا تھا کہ وہ اس آگ کو سرد کرنے کے لیے کیا کرتا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ میں نے یہ کامیابی بھی حاصل کرلی کہ میجر کے خانسامے کو بھی مخبروں میں شامل کرلیا اور اُسے دھمکی دی کہ اس کا میجر سیدھا جیل جا رہا ہے، اگر اُس نے (خانسامے نے) غداری کی تو وہ بھی جیل میں جائے گا۔

رات کو محمد خان آ گیا۔ وہ کرنل جانسن کا جانباز معتمد بن گیا تھا۔ میں نے اُسے ریلوے کی تفتیش کے متعلق بتایا جو اس نے اپنے روزنامچے میں بھی لکھ لیا۔ ہم دونوں اگلی کارروائی کے لیے پلان بناتے رہے۔

دوسرے دن شام کے وقت میں کرنل جانسن کے پاس بنگلے میں گیا۔ محمد خان نے میرے ساتھ کوئی بات نہ کی۔ اندر کرنل کو اطلاع دی۔ پھر مجھے بلایا۔ محمد خان باہر نکل گیا۔ میں نے کرنل جانسن کو بریگیڈ ہیڈکوارٹر کا اجازت نامہ (برائے تفتیش) دکھایا۔

"تم نے کسی ہندو لڑکی کے متعلق مجھ سے پوچھا تھا" ـــ اُس نے کہا ـــ "اُس کے متعلق میں کچھ نہیں جانتا۔"

"کرنل صاحب!" میں نے اُس سے پوچھا — "آپ نے چھٹی کہاں گزاری ہے؟"

"ڈلہوزی۔"

"قیام کس ہوٹل میں کیا؟" میں نے پوچھا۔ "ریسٹ ہاؤس میں رہے یا کہیں اور؟"

"دیکھو انسپکٹر!" اُس نے کہا۔ "بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا یہ اجازت نامہ تمہیں بالکل اجازت نہیں دیتا کہ تم میری پرائیویٹ زندگی کی باتیں بھی پوچھ سکتے ہو۔"

"کرنل صاحب!" میں نے کہا۔ "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے ساتھ تعاون کریں۔ میں آپ کا نوکر ہوں۔ آپ کے شہنشاہ کے قانون کے تحفظ کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ کیا آپ اپنے قانون کا احترام نہیں کریں گے؟ آپ یہ بتا دیں کہ ڈلہوزی جانے کے لیے آپ کون سے ریلوے سٹیشن پر اُترے تھے اور کون سی روڈ ٹرانسپورٹ سے ڈلہوزی پہنچے تھے؟"

وہ اتنا کچا آدمی نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ روانگی کے سٹیشن پر بکنگ اور آخری سٹیشن کی پڑتال کی جا سکتی ہے۔ اُس نے آخری سٹیشن صحیح بتایا اور پھر یہ بتایا کہ وہ ایک دن وہاں رہا۔ وہاں سے سٹیشن تک گیا اور ایک دوست کی کار سے ڈلہوزی گیا۔ میں نے اپنا یہ سوال دُہرایا کہ وہ ڈلہوزی کہاں ٹھہرا تھا۔

اُس نے جواب دینے کی بجائے ٹال مٹول کی۔ میں نے مسلسل ایک گھنٹہ اُس کے ساتھ مغز کھپائی کی مگر اُس نے ایسے ایسے پینترے بدلے کہ مجھے پریشان کر دیا۔ کمرے کے اندرونی دروازے کا پردہ گرا ہوا تھا۔ پردے کے نیچے مجھے دو پاؤں نظر آئے۔ یہ محمد خان کے پاؤں تھے۔ وہ چُھپ کر ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ کرنل جانسن مجھے ہر سوال کا صحیح جواب دیتا اور نہ ہی مجھے اُمید تھی کہ وہ صحیح جواب دے گا۔ مجھے اس کا صرف رویّہ دیکھنا تھا۔ وہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ کرنل جانسن نے ڈلہوزی تک کے سفر کو پُراسرار بنا دیا تھا۔ میں اصرار کرتا ہی رہا کہ وہ مجھے بتائے کہ کہاں ٹھہرا تھا۔

"میں شکار کھیلنے گیا تھا۔" اُس نے جواب دیا۔ "وہ باہر کیمپ کرتا رہا ہوں۔"

"مجھے وہ علاقہ بتا دیں جہاں آپ نے شکار کھیلا ہے۔" میں نے پوچھا — "آپ نے قلی تو ضرور رکھے ہوں گے۔"

اُس نے زِچ ہو کر جواب دیا — "میں یہاں بیٹھا اُس علاقے کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔"

"مجھے اپنے کارتوسوں کا ریکارڈ دکھا دیں۔" میں نے کہا۔ "آپ نے کتنا ایمونیشن فائر کیا؟ کتنا خریدا؟ کہاں سے خریدا؟"

وہ غصّے سے اُچھل پڑا۔ کہنے لگا۔ "میں بریگیڈ کمانڈر سے بات

کر کے تمہارے ساتھ بات کروں گا۔ میں برداشت نہیں کر سکتا
ایک انڈین انسپکٹر مجھے گھٹیا قسم کا ملزم سمجھے۔ تم جا سکتے ہو۔"

لاپتہ لڑکی خود آگئی

میں وہاں سے یہ یقین لے کر تھانے چلا گیا کہ کرنل جانسن اور ہندو لڑکی اگر جاسوس نہیں تو جاسوسی کی حد تک پُراسرار ضرور ہیں مگر مجھے تفتیش کے لیے کوئی ایسا زاویہ نظر نہیں آرہا تھا جس طرح سے حملہ کروں اور کامیاب ہو جاؤں۔ رات صوبیدار محمد خان نے م بتایا کہ مسلمان میجر کرنل جانسن کے گھر گیا تھا اور بہت دیر بعد واپس میرے مخبروں نے صبح آکر مجھے بتایا کہ رات گیارہ بجے میجر باہر گ اُس کا تعاقب کیا گیا لیکن آبادی میں کہیں غائب ہو گیا۔ ساڑھے بارہ بجے واپس آیا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی تھے جنہیں اندھیرے کی وجہ سے پہچانا نہ جا سکا۔ کرنل جانسن اپنے بنگلے میں رہا۔ مخبر ابھی رپورٹ دے کر رخصت ہوئے ہی تھے کہ ہندو لڑکی کا باپ آ گیا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ بھی جاسوسوں کے رنگ کا ممبر ہو سکتا ہے اور یہ اپنی بیٹی کو استعمال کر رہا ہے ....

"جناب کیس ختم کر دیں۔" اس نے کہا۔ "لڑکی رات واپس آگئی ہے۔ کہتی ہے کہ سہیلیوں کے ساتھ ڈلہوزی چلی گئی تھی۔"

"اور آپ نے مان لیا کہ وہ سہیلیوں کے ساتھ گئی تھی؟" میں نے پوچھا — "اور وہ ڈلہوزی ہی گئی تھی؟"

"بہرحال وہ واپس آگئی ہے۔" اُس نے شکست کھائے ہوئے لہجے میں دبی دبی زبان سے کہا — "یہ تو میری بدقسمتی ہے کہ میں اس قسم کی لڑکی کا باپ ہوں۔ میں مانوں یا نہ مانوں، اس سے اُسے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہرحال آپ کا کیس ختم ہو گیا ہے۔"

"جی نہیں مہاراج!" میں نے اُسے کہا۔ "کیس اب شروع ہوا ہے۔ آپ لڑکی کو یہاں لے آئیں۔"

وہ پس و پیش کرنے لگا۔ لڑکی کو تھانے میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا۔ "اگر آپ لڑکی کو میرے پاس نہیں لائیں گے تو میں آپ کے خلاف مقدمہ کھڑا کر دوں گا کہ آپ نے ایک مسلمان میجر کو ایک غلط بل پاس کرنے پر مجبور کرنے کے لیے اپنی لڑکی کو گھر میں چھپائے رکھا اور میجر کے خلاف شک کا تحریری طور پر اظہار کیا۔"

وہ سخت گھبرایا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "آپ جتنی رقم مانگتے ہیں ابھی دے دوں گا۔ یہ کیس فائل کر دیں۔ میں اس لڑکی کے ہاتھوں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر اسے لڑکی کو لانے کے لیے بھیج دیا تو یہ لڑکی کو کہیں غائب کر کے کہہ سکتا ہے کہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے۔ میں

نے اپنے اے۔ایس۔آئی سے کہا کہ لڑکی کو یہ بتا کر لے آئے تمہارا باپ تھانے میں بیٹھا ہے اور تمہیں بلا رہا ہے۔ وہ چلا گیا وہ لڑکی کو ایک گھنٹے بعد لے آیا۔

وہ واقعی غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی بلکہ اُس کا حسن خطرناک تھا۔ میں نے اُس کے باپ کو باہر نکال دیا اور لڑکی پوچھا کہ وہ کہاں گئی تھی۔ اُس نے جواب دیا کہ سہیلیوں کے ساتھ ڈلہوزی چلی گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ وہ سہیلیاں کون کون ہیں؟ اُن کے نام کیا ہیں؟ اور وہ ڈلہوزی کون سے ہوٹل میں ٹھہری تھی؟

"میں بالغ ہوں۔ جہاں چاہوں جا سکتی ہوں اور جہاں چاہوں ٹھہر سکتی ہوں۔" اُس نے جواب دیا۔

"بالغ ہو جانے سے لڑکی کو یہ اجازت نامہ نہیں مل جاتا کہ وہ اپنے والدین کو اور پولیس کو پریشان کر سکتی ہے۔" میں نے اسے کہا — "تمہارے باپ نے رپورٹ رجسٹر کرائی تھی کہ تم لاپتہ ہو گئی ہو۔ پولیس کئی دنوں سے تفتیش کر رہی ہے اور تم نے آ کے کہہ دیا ہے کہ میں بالغ ہوں۔ اب تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ ڈلہوزی گئی تھیں۔ مجھے اُس گھر کا یا ہوٹل کا نام بتاؤ جہاں تم ٹھہری تھیں اور سہیلیوں کے نام پتے بھی لکھواؤ۔"

آپ کے سامنے کپڑے اُتار دوں گی

پولیس کے ساتھ اُسے پہلی بار پالا پڑا تھا۔ اُس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ کبھی بے چین نظروں سے مجھے دیکھتی تھی اور کبھی سر جھکا لیتی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا — "تم کون سی گاڑی سے گئی تھیں اور کس تاریخ کو گئی تھیں؟"

اُس نے کہا کہ وہ بس سے گئی تھیں اور تاریخ بھی غلط بتائی۔ میں نے اُسے کہا — "تم فلاں تاریخ فلاں گاڑی سے فسٹ کلاس میں گئی تھیں۔ کہو تو میں یہ بھی بتا دوں کہ تم نے کس سٹیشن پر گاڑی چھوڑی اور وہاں سے کہاں گئیں۔"

اُس کی آنکھیں اُبل کر باہر آنے لگیں۔ میں نے اُسے سنبھلنے نہیں دیا اور پوچھا — "اگر تم بتا دو کہ کرنل جانسن کے ساتھ تم کہاں کہاں گئی تھیں تو میں تمہیں سلطانی گواہ بنا لوں گا۔"

"میں کرنل جانسن کو نہیں جانتی۔" اُس نے ذرا سنبھل کر کہا۔ "وہ کون ہے؟"

"جس کے سامنے تم فلاں میجر کے بنگلے میں تمام کپڑے اُتار دیا کرتی ہو۔" میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا — "وہ تمہارے جسم کے ایک ایک بال سے واقف ہے اور تم کہتی ہو کہ

"تم اُسے جانتی ہی نہیں۔"

وہ ڈھیٹ ہو گئی۔ کہنے لگی "اگر ایسی بات تھی تو آپ مجھے موقعہ پر گرفتار کر لیتے۔"

اس کے بعد اُس کا خوف ختم ہو گیا اور وہ سنبھل سنبھل کر باتیں کرنے لگی۔ میں نے اُسے بھرنے کے لیے اتنی باتیں کیں کہ میرے جبڑے تھک گئے۔

"انسپکٹر صاحب!" اُس نے کہا ۔۔۔ "آپ کیوں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ چلئے اپنے کوارٹر میں۔ میں آپ کے سامنے بھی کپڑے اتار دوں گی۔ چلئے ختم کیجئے اس "چکر بازی" کو۔" اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ میں نے اس کی آنکھیں اور مسکراہٹ دیکھی تو میں ایک بار تو کانپ ہی گیا۔ اس مسکراہٹ سے اور آنکھوں کی چمک سے بچنا آسان کام نہیں تھا۔ تفتیش کا یہ مرحلہ بڑا ہی صبر آزما ہوتا ہے۔ پتھر بھی موم ہو جایا کرتے ہیں۔ بڑے بڑے جابر تھانیداروں کی تھانیداریاں ریت کی ڈھیریاں بن جاتی ہیں اور زنجیریں پگھل جاتی ہیں۔ میں فرشتہ نہیں تھا لیکن اللہ نے مجھے بچا لیا کہ لڑکی کا باپ اندر آ گیا۔ میرا اے۔ ایس۔ آئی اُسے پیچھے گھسیٹ رہا تھا۔

میں کمرے سے نکل گیا اور لڑکی کے باپ کو اس قدر ڈانٹ پلائی کہ لڑکی کے حسن کا جادو اُتر گیا۔ لڑکی کے باپ کو میں نے تھانے سے نکال دیا۔ میں ایک خطرہ مول لے رہا تھا۔ لڑکی میری نگاہ میں

مشتبہ تھی مگر کوئی شہادت نہیں تھی، سوائے اس کے کہ اس نے اپنے خلاف شک پختہ کر دیا تھا۔ میں اُسے آزاد نہیں چھوڑ سکتا تھا اور اُسے حراست میں بھی نہیں لے سکتا تھا۔ خطرہ یہ تھا کہ اُس کا باپ میرے خلاف اپنی بیٹی کو حبسِ بیجا میں رکھنے کی فوری چارہ جوئی کر سکتا تھا۔ معاملہ جوان اور خوبصورت لڑکی کا تھا۔ کوئی مرد ہوتا تو میں نہ ڈرتا۔ لڑکی مجھ پر محض جھوٹا الزام عائد کر سکتی تھی کہ میں نے اُس کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ یہ ثابت تو نہ ہو سکتا تھا لیکن جج لڑکی کو دیکھ کر میرے خلاف شک کر سکتا تھا۔

میں نے یہ بھی سوچا کہ اسے ملٹری انٹیلی جنس کے حوالے کر دوں لیکن میرے پاس کوئی ٹھوس جواز نہیں تھا اور حقیقت یہ ہے کہ لڑکی میں واقعی ایسا جادو تھا کہ میرا ایمان لڑھک سکتا تھا۔

شام ہو گئی۔ اُس کا باپ پھر آ گیا۔ میں نے اُس کی تحریری ضمانت پر لڑکی اُس کے حوالے کر دی اور سختی سے ہدایت دی کہ لڑکی ہر وقت گھر میں رہے اور جب بھی طلب کی جائے فوری طور پر پیش کی جائے۔ باپ کو میں نے خبردار کر دیا کہ اس نے ذرا سی بھی ہیرا پھیری کی تو اُسے گرفتار کر لیا جائے گا ۔۔۔ لڑکی چلی گئی۔

میں صوبیدار محمد خان کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہ آیا۔ دوسرے دن میں نے آزمائش کے طور پر لڑکی کو بلایا۔ اُس کا باپ اُسے فوراً لے آیا۔ میں نے لڑکی کو اکسایا کہ وہ اقبالِ جرم کر کے سلطانی گواہ

بن جائے۔ اُس نے اپنا جرم پوچھا لیکن میں نے اُسے نہیں بتایا۔ کچھ دیر بعد میں نے اُسے واپس بھیج دیا اور سوچنے بیٹھ گیا کہ کون سی لائن اختیار کروں۔ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

میجر بول رہا تھا۔ اُس نے کہا ــــــ "آپ نے مجھے سلطانی گواہ بننے کی پیش کش کی تھی۔ میں نے اس پر غور کیا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ آپ کے مشورے پر عمل کروں۔ آپ مجھے کس طرح یقین دلا سکتے ہیں کہ مجھے سلطانی گواہ بنا لیا جائے گا؟ ...... اگر پسند کریں تو رات ساڑھے دس بجے میرے بنگلے میں آ جائیں۔ تفصیلی بات کریں گے۔ میں احتیاط کی غرض سے تھانے میں نہیں آنا چاہتا۔ متعلقہ لوگ دیکھ لیں گے پھر انہیں پکڑنا آپ کے لیے مشکل ہو جائے گا۔"

میجر کے بنگلے میں

میں بہت خوش ہوا۔ سلطانی گواہ مل جانے سے تفتیش کی سردردی ختم ہو جائے گی۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں رات ساڑھے دس بجے آ جاؤں گا۔ میں خوش تو ضرور تھا لیکن جیسا کہ میں نے آپ کو پہلی کہانیوں میں بتایا ہے کہ ملزم کے اقبالِ جرم سے کیس مکمل نہیں ہو جایا کرتا۔ یہاں بھی یہ خطرہ تھا کہ ایک ملزم اقبالِ جرم کرے گا

تو کیا مجھے شہادت بھی مل جائے گی؟ یہ تو اکثر ہوتا تھا کہ ایک ملزم کو سلطانی گواہ بنا کر اس پر اعتماد کیا اور نامکمل سی شہادت لے کر کورٹ میں چلے گئے۔ وہاں سلطانی گواہ منحرف ہو گیا اور کہہ دیا کہ لالچ دے کر مجھ سے اقبالِ جرم کرایا گیا ہے۔ یہاں یہ خطرہ زیادہ شدید تھا کیونکہ یہ جاسوسی کا معاملہ تھا۔ جاسوسی کی شہادت فراہم کرنا بعض حالات میں ناممکن ہو جاتا ہے۔ تاہم میجر سے ملنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں صوبیدار محمد خان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ آ جاتا۔ تو میں جاسوسی کے متعلق دو چار باتیں پوچھ لیتا مگر وہ نہ آیا۔ شام ہو گئی پھر رات کے نو بج گئے۔ میں میجر کے ہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ ریوالور پتلون کی جیب میں ڈال لیا اور کسی حد تک فاتحانہ انداز سے چل پڑا۔ میں بہت خوش تھا کہ جاسوسی کا پہلا ہی کیس ہاتھ میں لیا ہے اور کامیاب رہا ہوں۔

میں میجر کے بنگلے سے ذرا دور تانگے سے اُترا تا کہ اپنے کسی مخبر کو پتہ چل جائے کہ میں اندر جا رہا ہوں۔ ایک آدمی مل گیا۔ اُس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی اندر گیا ہے۔ اُس سے پندرہ منٹ بعد ایک کار اندر گئی ہے جس میں چار آدمی تھے۔ مخبر ان آدمیوں کے حلیے نہ بتا سکا کیونکہ روشنی دور تھی۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔ مجھے معلوم نہیں

تھا کہ یہ لوگ جاسوسی کے گروہ کے تھے یا میجر کے ملاقاتی تھے۔ میں اندھیرے میں ہاتھ مار رہا تھا اور ان ان دیکھے چار آدمیوں کو شناخت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بہت سوچا اور آخر اس نتیجے پر پہنچا کہ میجر کے ملاقاتی ہوں گے۔ اندر اطلاع کرا دیتا ہوں۔ میجر باہر آ جائے گا۔

میں بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہو گیا۔ برآمدے کے سامنے کار کھڑی تھی۔ یہ پرانے دور کا بنگلہ تھا۔ ارد گرد کھلی جگہ تھی، اور چاروں طرف دو اڑھائی گز اونچی فصیل تھی۔ ایک طرف باغیچہ تھا اور درخت بھی تھے۔ میں برآمدے میں داخل ہوا اور دروازے پر دستک دی۔ اندر سے ایک آدمی باہر آیا۔ نوکر لگتا تھا۔ اس نے برآمدے کی بتی نہیں جلائی۔

اُس نے آہستہ سے پوچھا — "آپ داروغہ ہیں؟"

میں نے ہاں کہی تو اس نے کہا "آیئے، میجر صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

میجر قتل اور میں اغوا ہو گیا

وہ میرے آگے آگے چل پڑا۔ یہ ایک کمرہ تھا۔ بتی نہیں جل رہی تھی۔ اس نے اگلے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ کمرہ روشن تھا۔

اُس نے کہا۔ "اندر چلے جائیں"۔ میں اندر گیا تو میرے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ کمرہ وسیع تھا۔ میں اس کمرے میں پہلے بھی آ چکا تھا۔ اب دیکھا کہ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک کونے میں ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ میں سمجھا کہ میجر دوسرے کمرے میں ملاقاتیوں کے ساتھ مصروف ہو گا۔ میں ایک صوفے پر بیٹھتے ہی لگا تھا کہ مجھے خون کی بو محسوس ہوئی۔ میں اس بو سے واقف تھا۔ کئی تازہ لاشیں اور زخمی میرے ہاتھوں سے گزر چکے تھے۔ انسانی خون کی بو کو میں دو میل دور سے بھی سونگھ سکتا تھا۔ میجر کا ڈرائنگ روم بھی تازہ خون کی بو سے بھرا ہوا تھا۔

میں بیٹھتے بیٹھتے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ ایسے محسوس ہونے لگا جیسے کوئی ان ہونی بات ہو چکی ہے یا ہونے والی ہے۔ تھانیداراں کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔ میری نگاہیں فرش پر تیزی سے گھومنے لگیں۔ مجھے بڑے صوفے کے پیچھے سے خون کی لکیر سامنے آتی نظر آئی۔ فرش پر دری یا قالین نہیں تھا۔ سیمنٹ کا چمکیلا فرش تھا۔ میں نے صوفے کے پیچھے جا کر دیکھا۔ وہاں میجر کی لاش پڑی تھی۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ دائیں ٹانگ بائیں کے اوپر تھی۔ دایاں ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔ دوسرا بازو فرش پر تھا اور خون اتنا زیادہ کہ میجر کے تمام کپڑے لال سرخ تھے۔ اسے خنجر یا چاقو کے متعدد وار کر کے ہلاک کیا گیا تھا۔

میں ابھی سوچنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ کیا واقعہ ہے کہ مجھے اپنے پیچھے ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں پیچھے دیکھنے ہی لگا تھا کہ کسی نے پیچھے سے میرے دونوں بازو جکڑ لیے۔ اس کے ساتھ ہی پیچھے سے کسی نے میرے منہ پر اتنا بڑا کپڑا پھینکا جس میں میرا سارا چہرہ، سر سے ٹھوڑی تک ڈھک گیا۔ کپڑا موٹا تھا۔ نہایت پھرتی سے کپڑا میرے سر کے پیچھے باندھ دیا گیا۔ اس دوران کسی کے ہاتھ نے میری پتلون کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ جسمانی لحاظ سے میں گیا گزرا تو نہیں تھا۔ میں نے جسم کو پوری طاقت سے دائیں سے بائیں کو جھٹکا دیا۔ ایک آدمی میرے جسم سے الگ ہو کر گرا مگر بڑی تیزی سے میرے ایک ٹخنے سے مضبوط رسّی باندھ دی گئی۔ رسّی کھینچی گئی تو میں پاؤں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ ٹخنہ دوسرے ٹخنے سے جا ملا۔ میں ایک پہلو کی طرف گرنے لگا تو دو آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا۔ فوراً ہی دوسرا ٹخنہ بھی رسّی میں بندھ گیا۔

میری آنکھیں بند تھیں، منہ بند تھا۔ دونوں بازو پیچھے کو جکڑے ہوئے تھے۔ فوراً ہی میری کلائیاں بھی رسّی سے باندھ دی گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ چار آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے لاش کی طرح اٹھا لیا۔ یہ سارا کام حیران کن تیزی سے ہُوا۔ خون کی لکیر دیکھنے سے لے کر اٹھائے جانے تک پورے

دو منٹ بھی صرف نہیں ہوئے ہوں گے۔

وہ مجھے اُٹھا کے لے چلے تو پہلا خیال یہ آیا کہ یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہے۔ یہ سوچا کہ یہ لوگ مجھے کہیں لے جا مجبور کریں گے کہ میں جاسوسی کا کیس دبا لوں تو میں راضی ہو جاؤں گا اور یہ لوگ مجھے آزاد کر دیں گے محض خوش فہمی تھی۔ وہ مجھے قتل کر کے لاش کہیں دبا دینے یا دریا (جو قریب ہی تھا) میں بہا دینے کے لیے لے جا رہے تھے۔ مجھے پہلی بار محسوس ہُوا کہ جاسوس بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں اور وہ قتل تک کر گزرتے ہیں مگر یہ احساس میرے اندر اُس وقت پیدا ہُوا جب وقت گزر چکا تھا۔ اب یہ احساس میرے ساتھ اُس قبر میں جا رہا تھا جسے کوئی دیکھ بھی نہ سکے گا۔ اگر مجھے دو سیکنڈ کا بھی موقع مل جاتا تو میں ان لوگوں کا مقابلہ کرتا۔ پھر وہ میری لاش اُٹھا کے وہاں سے نکلتے اور ایک لاش اُن کے اپنے ساتھی کی بھی ہوتی مگر خدا کو یہی منظور تھا کہ میرا انجام یہی ہو۔

مجھے نظر نہیں آتا تھا کہ مجھے کس طرف لے جایا جا رہا ہے۔ وہ لوگ بالکل خاموش تھے۔ اُن کی ہلکی سی سرگوشی بھی نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ اس کام کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار نظر آتے تھے۔ اُس دور میں یعنی دوسری جنگِ عظیم کے آغاز میں ابھی کمانڈو اور گوریلا جیسے الفاظ سے کوئی واقف نہیں تھا۔ یہ لوگ ہندوستانی ہی ہوں گے، لیکن وہ جرمنی کے تجربہ کار کمانڈو اور گوریلے لگتے تھے۔ میں پیشہ ور

مجرموں کے کمالات سے اچھی طرح آگاہ تھا لیکن اُن میں یہ تیزی اور استادی نہیں تھی جو میں نے ان میں دیکھی۔

مجھے بھی قتل ہونا تھا

انہوں نے مجھے کار کی پچھلی سیٹ پر پھینکا پھر سیٹ سے نیچے لڑھکا کر میری ٹانگیں دُوہری کر دیں۔ سیٹ پر دو یا شاید تین آدمی بیٹھ گئے۔ انہوں نے پاؤں میرے جسم پر رکھ دیئے۔ یہ دو آدمیوں کے پاؤں تھے۔ کار کے دروازے بند ہو گئے۔ انجن سٹارٹ ہوا اور کار چل پڑی۔ میں نے دل میں دُعا کی کہ مخبر نے جو بنگلے کے باہر کھڑا تھا مجھے دیکھ لیا ہو مگر توقع کم ہی تھی۔ کار بنگلے سے ذرا آہستہ نکلی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کس طرف مُڑی۔ اچانک اس کی رفتار تیز ہو گئی

میں سوچنے لگا کہ یہ سب کیا ہُوا ہے۔ میجر نے اقبالِ جرم کرنے اور سلطانی گواہ بننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اُس نے میرے ساتھ ٹیلی فون پر بات کی تھی۔ اُس کے کسی ملازم نے سُن لیا ہوگا اور یہ ملازم بھی اسی گروہ کا آدمی ہوگا۔ اُس نے کرنل جانسن یا اپنے گروہ کا جو کمانڈر تھا اُسے بتا دیا ہوگا۔ یہ لوگ چونکہ تربیت یافتہ تھے، اس لیے انہوں نے ایک پتھر سے دو شکار کیے۔ میں نے وہ وقت پیشِ نظر رکھا جب مجھے میجر کے بنگلے میں جانا تھا۔ میرے لیے انہوں

نے جال بچھا رکھا تھا۔ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے میجر کو قتل کیا گیا۔ انہوں نے اُسے کہا ہوگا کہ وہ اقبالِ جرم نہ کرے۔ وہ نہیں مانا ہوگا، لہٰذا اُسے قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد وہ میرے انتظار میں بیٹھ گئے، اور اُن کی سکیم سو فیصد کامیاب رہی۔

اس میں ہندو لڑکی کا بھی عمل دخل ہوگا۔ اُس نے اپنے گروہ کو بتایا ہوگا کہ اُسے باپ کی شخصی ضمانت پر رہا کر کے پابند کر لیا گیا ہے اور یہ انسپکٹر اُسے چھوڑے گا نہیں۔ گروہ میں کوئی ایسا ذہین آدمی بھی تھا جسے معلوم تھا کہ تھانے میں اُن کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی، اس لیے انسپکٹر کو غائب کر دینے سے یہ کیس بھی غائب ہو جائے گا۔ یہ صحیح تھا کہ یہ کیس میرے سینے میں تھا کاغذات پر نہیں تھا یا صوبیدار محمد خان اور ملٹری انٹیلی جنس کے دو انگریز افسر آگاہ تھے کہ میں اس سلسلے میں تفتیش کر رہا ہوں۔

میں نے ایک ٹیکنیکل غلطی کی تھی۔ مجھے چاہیے تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس سے یہ رپورٹ لکھوا لیتا کہ فلاں فلاں افراد پر جاسوسی کا شک ہے۔ ان کے خلاف تحقیقات کی جائے۔ میں نے اس کاغذی کارروائی کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور محمد خان کی باتوں میں آ کر تفتیش شروع کر دی، مگر کاغذی کارروائی ہوتی یا نہ ہوتی، میں ایسے ماہر جاسوسوں کے قبضے میں آ چکا تھا جنہیں کچھ پرواہ نہیں تھی

کہ اُن کے خلاف کوئی کاغذی کارروائی ہوئی ہے یا نہیں۔ اُن کی
اپنی کارروائی ہر لحاظ سے کامیاب تھی۔ وہ مجھے ختم کرکے کہیں دبا
دینے کے لیے لے جا رہے تھے۔ کوئی معجزہ ہی مجھے بچا سکتا تھا
میں نے خدا سے یہی التجا کی کہ یہ لوگ مجھے مارنے سے پہلے ایک
آدھ منٹ کے لیے آزاد کر دیں۔ میں مردوں کی طرح مرنا چاہتا تھا

کار کی رفتار بہت تیز تھی۔ باہر کی کوئی آواز نہیں سنائی
دیتی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ کار اب موڑ نہیں مُڑ رہی
شہر کے موڑ ختم ہوگئے تھے۔ کار یقیناً شہر سے باہر نکل گئی تھی
کار کی رفتار اچانک اس طرح کم ہوئی جیسے ڈرائیور نے ایکسیلیٹر
سے یکلخت پاؤں اُٹھا لیا ہو۔

مجھے کار میں کسی کی آواز سنائی دی:

THEY HAVE BLOCKED THE ROAD

"انہوں نے سڑک بند کر رکھی ہے۔" یہ آواز کسی انگریز کی تھی۔
میرے اوپر سے یعنی پچھلی سیٹ سے کسی نے کہا: LEAVE
THE ROAD... RIGHT "سڑک کو چھوڑ دو۔ دائیں۔" اس
آواز کا لب و لہجہ ہندوستانی تھا۔ اس کے ساتھ کار دائیں کو مڑ گئی
میں نے اسے نیچے اترتے محسوس کیا۔ یہاں کوئی راستہ نہیں تھا
کار اُچھل رہی تھی۔ میری ہڈیاں ٹوٹنے لگیں۔ مجھے پھر آواز سنائی دی
THEY ARE CHASING "وہ ہمارا تعاقب کر رہے ہیں"

کار کی رفتار اور تیز ہوگئی لیکن اتنی نہیں جتنی سڑک پر تھی۔
ڈرائیور نے گیئر بدلا اور کار دائیں بائیں ہونے اور اُچھلنے لگی۔

تعاقب اور فائرنگ

پچھلی سیٹ سے ایک آدمی اُٹھا۔ اُس کے پاؤں میرے اوپر
تھے۔ اُس کے جسم کا سارا بوجھ میرے سینے پر آگیا۔ میں نے محسوس
کیا کہ وہ آگے کو جھک گیا ہے۔ اچانک کار کا انجن بند ہوگیا۔ اگلی
سیٹ سے انگریز کی آواز آئی۔ WHAT IS IT? "یہ کیا ہے؟"
کار کو کچی زمین نے روک لیا۔ میں نے کار کا دروازہ کھلتا سنا۔
میرے اوپر جو آدمی کھڑا تھا وہ میرے اوپر سے ہٹ گیا۔ باہر سے
آواز آئی "ہینڈز اپ۔ جو ہلے جلے گا، مارا جائے گا۔" یہ آواز صوبیدار محمد خان
کی طرح لگتی تھی۔

فوراً بعد کسی دوسری گاڑی کی بریکیں لگیں۔ پھر دوڑتے قدموں
کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ کسی انگریز کی بلند آواز
SHOOT HIM. BELOW THE BELT سنائی دی
"اس پر گولی چلاؤ۔ کمر سے نیچے۔"
کوئی بھاگ گیا تھا۔ اُسے زندہ پکڑنے کے لیئے ٹانگوں پر گولیاں
چلائی جا رہی تھیں۔ اِدھر سے یکے بعد دیگرے ریوالور کی تین

گولیاں فائر ہوئیں۔ اُدھر سے چار گولیاں فائر ہوئیں۔ کار میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کو باہر نکالا گیا۔ باہر بھاگ دوڑ تھی۔ میں ابھی اندر پڑا تھا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ بندھے بندھے ہی مجھے گولی نہ لگ جائے۔

آخر مجھے باہر نکالا گیا۔ میرے ہاتھ اور پاؤں کھُل گئے۔ چہرے سے کپڑا بھی ہٹ گیا۔ بہت سے آدمی بیک وقت بول رہے تھے۔ زیادہ تر انگریزی بولی جا رہی تھی۔ یہ سب انگریز تھے۔ پچھلی گاڑی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے صوبیدار محمد خان کو دیکھا۔ اُس نے میرے ساتھ بغلگیر ہو کر پوچھا "گرائیں ٹھیک ہو؟" پھر مجھے دو باوردی انگریز افسر نظر آئے اور پھر میں نے چار گوروں کو دیکھا۔ یہ سب ملٹری پولیس کے تھے اور سب سے آخر میں مجھے کرنل جانسن نظر آیا۔ اُسے ملٹری پولیس کے دو گورے بازوؤں سے پکڑے ہوئے لا رہے تھے۔ وہی کار میں سے بھاگا تھا۔ اُس کی ایک ٹانگ سے خون اُبل رہا تھا۔ اُس نے انگریزی میں پہلی بات یہ کہی کہ مجھے ہسپتال لے چلو۔

اُسے ملٹری پولیس کی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ دو اور آدمی تھے جو میرے والی کار میں تھے۔ وہی مجھے اُٹھا کر لائے تھے۔ انہیں ایک ہی ہتھکڑی میں باندھ دیا گیا اور انہیں بھی ملٹری پولیس کی گاڑی میں لے گئے۔ ایک انگریز میجر کار کے سٹیرنگ

پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک گورا سارجنٹ بیٹھا۔ پچھلی سیٹ پر مجھے اور صوبیدار محمد خان کو بٹھایا گیا۔

کار چلی تو محمد خان نے مجھے کہا — "گرائیں! تمہارے ٹخنے اور ہاتھ میں نے باندھے تھے۔" میں نے اُسے حیران ہو کر دیکھا تو اُس نے کہا۔ "میں بھی اُن لوگوں میں تھا جو تمہیں میجر کے بنگلے سے اٹھا لائے تھے۔ ابھی چپ رہو۔ کل ساری بات بتاؤں گا۔"

"میجر کو قتل کس نے کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں" اُس نے کہا۔ "ہمارے وہاں جانے سے پہلے قتل ہو چکا تھا۔ ابھی زیادہ نہ بولو۔"

اتنے میں انگریز میجر نے ہمارے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ کار چھاؤنی میں داخل ہوئی۔ دوسری گاڑی فوجی ہسپتال کی طرف چلی گئی۔ ہماری کار مسلمان میجر کے بنگلے میں داخل ہو گئی۔ انگریز میجر کو ابھی غالباً یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ مسلمان میجر قتل ہو چکا ہے۔ ہم سب کار سے اُترے اور بنگلے کے اندر چلے گئے۔ انگریز میجر موقعۂ واردات دیکھنا چاہتا تھا۔ ڈرائنگ روم میں گئے تو میجر آگے آگے تھا۔ صوبیدار محمد خان اُس سے آگے ہو گیا اور میجر کو ڈرائنگ روم میں صوفے کے پیچھے لے گیا جہاں مسلمان میجر کی لاش پڑی تھی۔ انگریز میجر نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ کیا ہے؟"

"ہم جب بنگلے کے پھاٹک میں داخل ہوئے تو ایک آدمی اندر

سے نکل کر برآمدے میں آیا۔" محمد خان نے کہا۔" ہم کار میں بیٹھے اُسے پہچان نہیں سکے۔ وہ ایک طرف کو دوڑ پڑا اور فصیل کود کر غائب ہو گیا۔ ہم اندر گئے تو میجر کی لاش نظر آئی۔"

"یہ قتل تمہاری سکیم میں تو نہیں تھا؟" میجر نے پوچھا۔

"نہیں۔" صوبیدار محمد خان نے جواب دیا۔" یہ میجر پوری طرح ہماری سکیم میں شامل تھا۔ کرنل جانسن بھی اس سے مطمئن تھا اسے قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔"

انگریز میجر نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔" انسپکٹر! معلوم ہوتا ہے کہ یہ کیس تمہارا ہے۔ ہمارے کیس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"پھر آپ سب یہاں سے دور ہٹ جائیں۔" میں نے اُسے کہا۔" اس کمرے سے نکل جائیں۔ میں اس کے اردلی اور خانساماں کو بلاتا ہوں۔"

"وہ دونوں آپ کو نہیں ملیں گے۔" صوبیدار محمد خان نے کہا۔ "انہیں شام کو ہی چھٹی دے دی گئی تھی۔"

میں نے مقتول کے فون سے اپنے اے ایس۔ آئی کو مع مزدور عملے کے فوراً آنے کو کہا تاکہ لاش کے متعلق کارروائی کرے۔ اس کے بعد ملٹری پولیس کے اس میجر نے مجھے اور محمد خان کو اپنے ساتھ لیا اور اپنے ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ وہاں میرے تفصیلی بیانات

قلمبند کیے گئے۔ سحر کے ساڑھے تین بج گئے۔ پھر انہوں نے مجھے کہا۔ کہ میں انہیں ہندو لڑکی کے گھر لے چلوں۔ اُسے گرفتار کرنا تھا۔ میں ساتھ ہو گیا۔

ہندو کی کوٹھی بہت شاندار تھی۔ لڑکی کا باپ دستک پر باہر آیا۔ اُسے لڑکی کو باہر لانے کو کہا گیا۔ وہ منت سماجت اور پس و پیش کرنے لگا۔ انگریز میجر نے ریوالور نکال لیا اور غصے سے کہا ـــ "اُسے باہر لاؤ۔"

لڑکی کو وہ باہر لے آیا۔ میجر نے اُسے اشارے سے کہا کہ گاڑی میں بیٹھو۔ وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ مجھے یہ کہہ کر چھٹی دے دی گئی کہ آٹھ بجے صبح ملٹری انٹیلی جنس کے دفتر پہنچ جاؤں۔ میں حیران و پریشان اپنے تھانے کو روانہ ہو گیا۔

میرے اغوا اور قتل کا ڈرامہ

ملٹری پولیس نے جو کارروائی کی وہ آپ کے لیے دلچسپ نہیں ہو گی۔ میں آپ کو اس واقعہ کا یہ حصہ سنا دیتا ہوں کہ مجھے اغوا کرنے کا ڈرامہ کس طرح کھیلا گیا۔ یہ مجھے بعد میں محمد خان نے سنایا تھا۔ میں نے صوبیدار محمد خان سے کہا تھا کہ وہ کرنل جانسن کے دل میں اپنا اعتماد پیدا کرے جو اس نے نہایت خوش اسلوبی اور

کامیابی سے کر لیا۔ اُس نے ایک نوجوان اور تعلیم یافتہ طوائف کرنل جانسن کو پیش کی۔ دوسرا کام یہ کیا کہ میں کرنل جانسن سے دوسری بار تحقیقات کرنے گیا تو محمد خان ہماری باتیں دوسرے کمرے میں کھڑا سنتا رہا۔ اُس نے دیکھا کہ کرنل غصے میں آ گیا۔ میں وہاں سے واپس آیا تو محمد خان نے کرنل کے ساتھ میرے خلاف باتیں کیں اور کہا ـــــ "صاحب بہادر! میں آپ کی بے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں اس انسپکٹر کو قتل کر دوں گا۔"

مختصر یہ کہ اُس نے نہایت تھوڑے سے دنوں میں کرنل جانسن پر اعتماد جما لیا۔ یہ کامیابی اُس نے کیسے حاصل کی؟ اس کی تفصیلات بہت طویل ہیں۔ محمد خان غیر معمولی طور پر ذہین آدمی تھا۔ کرنل جانسن نے اسے کسی طریقے سے آزمایا بھی تھا۔ دو دنوں میں محمد خان کرنل کے جاسوسی رنگ کا ممبر بن چکا تھا۔ کرنل نے اسے پانچ سو روپیہ نقد دیا اور اُسے بتایا کہ ایک مشن کا اسے ایک ہزار روپیہ ملے گا۔

میرے متعلق ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں نے ان کی دُکھتی رگ پکڑ لی ہے اور انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ مسلمان میجر نے کرنل جانسن کو میرے متعلق بتایا کہ اس انسپکٹر کو راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک رشوت اور دوسرا یہ کہ اسے غائب کر دیا جائے۔ صوبیدار محمد خان کے دماغ نے کام کیا۔ اس نے مشورہ

دیا کہ انسپکٹر کو اغوا کر کے قتل کیا جائے اور لاش دریا میں پھینک دی جائے۔ کرنل جانسن کے تجربہ کار دماغ نے اسی طریقے کو بہتر سمجھا اور کہا کہ اگر اس انسپکٹر کو رشوت دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اُسے یقین دلا دیا ہے کہ ہم جُرم کر رہے ہیں۔ پھر یہ شخص ہم سے آئے دن رشوت طلب کرے گا اور بلیک میلنگ جاری رکھے گا۔ اس کا واحد علاج یہی ہے کہ اسے گم کر دیا جائے۔

صوبیدار محمد خان نے اس سکیم میں سب سے زیادہ دلچسپی کا اظہار کیا اور پیش کش کی کہ اس کام میں وہ سب سے آگے رہے گا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ کرنل جانسن نے کہا تھا کہ اُس نے پولیس سٹیشن سے معلوم کرا لیا ہے کہ ان کے خلاف کوئی رپورٹ رجسٹر نہیں کی گئی۔ اس لیے انسپکٹر کے لاپتہ ہو جانے سے کیس بھی لاپتہ ہو جائے گا۔ صوبیدار محمد خان یہ معلوم نہیں کر سکا کہ پولیس سٹیشن میں کرنل کا کون ایجنٹ تھا جس نے اسے یہ بتا دیا کہ کوئی کیس رجسٹر نہیں ہُوا۔ ہو سکتا ہے باہر کے کسی ایجنٹ نے پولیس سٹیشن کے کسی ذمہ دار فرد سے دوستی کر رکھی ہو۔ جاسوسوں کے ہاتھ بڑے لمبے ہوتے ہیں۔

پھر ہندو لڑکی کو میں نے تھانے میں بلا لیا۔ اس کی رپورٹ مسلمان میجر اور کرنل جانسن کو مل گئی۔ پھر میں نے لڑکی کو شخصی ضمانت سے پابند کر کے گھر بھیجا تو یہ اطلاع بھی کرنل جانسن کو

پہنچ گئی۔ اس صورتِ حال میں ان لوگوں کے لیے ضروری ہو گیا کہ مجھے قتل کر کے میری لاش غائب کر دیں۔ محمد خان کو یہی طریقہ کار پسند تھا کیونکہ وہ اس گروہ کو جرم کرتے ہوئے عین موقعہ پر گرفتار کرانا چاہتا تھا۔ مسلمان میجر (مقتول) نے بڑی مسرّت سے کرنل جانسن کو بتایا کہ میں نے اُسے اقبالِ جرم کرنے اور سلطانی گواہ بننے کے لیے کہا ہے۔ اسی پیش کش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طے پایا کہ میجر مجھے اقبالِ جرم کے متعلق بات چیت کے لیے گھر بلائے گا اور وہاں سے مجھے اغوا کر لیا جائے گا۔

صوبیدار محمد خان نے مجھے بتایا کہ کرنل جانسن اس قدر دانشمند آدمی تھا جتنا کوئی انسان تسلیم بھی نہیں کر سکتا لیکن خدا نے اس کی عقل پر ایسا پردہ ڈالا کہ وہ محمد خان کی باتوں میں آ گیا۔ اُسے یہ تو علم ہی نہیں تھا کہ محمد خان انٹیلی جنس کا صوبیدار ہے۔ کرنل اسے رسالے کا پرانا سوار (سپاہی) سمجھ رہا تھا اور اُس نے محمد خان کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ پرانا سپاہی ہونے کی وجہ سے وہ تجربہ کار اور عقلمند ہو گیا ہے۔ یہ کرنل جانسن کی پہلی اور آخری غلطی تھی۔

آخر اغوا پارٹی میں تین آدمی رکھے گئے۔ ایک صوبیدار محمد خان تھا۔ باقی دو محمد خان کے لیے نئے چہرے تھے۔ وہ فوجی نہیں تھے۔ ایک ہندو اور دوسرا اینگلو انڈین تھا۔ دونوں جوان تھے۔ کرنل

جانسن اس سکیم کی کمانڈ خود کرنا چاہتا تھا۔ اُسے پکڑے جانے کا خطرہ ہی نہیں تھا۔ اُس نے کہا کہ کار وہ خود چلائے گا۔ طے یہ ہوا تھا کہ مجھے اغوا کر کے دریا تک لے جائیں گے۔ میرا گلا گھونٹ دیا جائے گا اور میری لاش کے ساتھ بڑے بڑے پتھر باندھ کر دریا کے درمیان اُس جگہ پھینکا جائے گا جہاں سردیوں میں بھی پانی گہرا رہتا ہے۔ مسلمان میجر کا کام اتنا ہی تھا کہ مجھے اپنے بنگلے میں بلائے گا اور شام سے پہلے وہ اپنے اردلی اور خانساماں کو چھٹی دے دے گا تاکہ گھر میں وہ اکیلا رہے۔

قاتل جاسوس تھے یا سسرال والے؟

مجھے ٹیلیفون پر میجر نے بلایا۔ میں نے کہہ دیا کہ آؤں گا۔ صوبیدار محمد خان نے مجھے بتایا کہ میجر نے انہیں اطلاع دے دی تھی۔ یہ پارٹی میرے وہاں پہنچنے سے تقریباً نصف گھنٹہ پہلے بنگلے کے احاطے میں پہنچ گئی۔ انہوں نے اندر سے ایک آدمی کو برآمدے میں آتے دیکھا۔ روشنی نہیں تھی۔ اس آدمی نے بنگلے میں کار داخل ہوتے دیکھی تو وہ پھاٹک کی طرف آنے کی بجائے بائیں طرف کو دوڑا اور فصیل پھلانگ کر غائب ہو گیا۔ ان لوگوں نے کار روک لی۔ سکیم کے مطابق اس وقت بنگلے میں میجر کے سوا کسی اور کو

نہیں ہوا ایسا ہی تھا۔ یہ حیرت والی بات تھی کہ یہ کون تھا اور بھاگ کیوں گیا؟

کرنل جانسن نے یہ خطرہ ظاہر کیا کہ شاید میجر خود بھاگ گیا اور یہ اس پارٹی کو پھانسنے کا اہتمام ہو رہا ہے۔ کار پھاٹک کے قریب ہی روک لی گئی۔ بہت سوچ بچار کے بعد صوبیدار محمد نے پیش کش کی کہ وہ اندر جا کے دیکھتا ہے کہ اندر کیا ہے۔ اُس اکیلے اندر جا کر دیکھا۔ اُسے میجر مرا ہُوا نظر آیا۔ اُس نے باہر آ کر جانسن کو بتایا۔ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر وہیں کھڑے رہے کہ آگے جائیں یا نہیں۔ ایک تانگے کی آواز سنائی دی۔ یہ میرا تھا۔ میں نے تانگہ بنگلے سے دور رکوا لیا تھا۔ وہاں میرا ایک گھوم پھر رہا تھا۔ میں اُس سے رپورٹ لینے کے لیے رک گیا تھا۔

صوبیدار محمد خان نے پھاٹک میں آ کر مجھے دیکھ لیا کہ میں آدمی کے ساتھ باتیں کر رہا ہوں۔ وہاں سڑک کی بتی روشن تھی۔ خان نے مجھے پہچان کر کرنل جانسن سے کہا ـــ "انسپکٹر آ رہا ہے۔ جو ہوتا ہے دیکھا جائے گا۔ اسے اڑا دو" ـــ کرنل جانسن نے کار چلائی اور برآمدے کے قریب جا کر روکی۔ یہ چاروں کار سے نکل کر چلے گئے اور ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں رک گئے۔

صوبیدار محمد خان اس سکیم کو ملتوی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اُس نے ملٹری انٹیلی جنس کو اطلاع دے رکھی تھی کہ رات فلاں

ایک کار دیرا کی طرف جائے گی۔ اس میں وہ خود جاسوسوں کی پارٹی کے ممبر کی حیثیت سے پارٹی کے ساتھ ہوگا۔ اس کار میں چھاؤنی کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او اور احمد یار خان رسیوں میں بندھا ہُوا لے جایا جا رہا ہوگا اور کار کا ڈرائیور کرنل جانسن ہوگا۔ ملٹری انٹیلی جنس نے ملٹری پولیس کے گورے، ایک خاص مقام پر شہر سے باہر کار روکنے کے لیے تیار کر لیے تھے۔

محمد خان کو معلوم تھا کہ ملٹری پولیس اس مقام پر پہنچ چکی ہوگی، اس لیے یہ سکیم رکنی نہیں چاہیے۔ کرنل جانسن اسے ملتوی کرنے کی سوچ رہا تھا لیکن محمد خان نے غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کر کے اسے اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ میں نے بنگلے کے دروازے پر دستک دی، دروازہ کھولنے والا اس پارٹی کا ہندو ممبر تھا۔ اس نے مجھے ڈرائنگ روم تک پہنچا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔

اُس مقام پر جہاں ملٹری پولیس نے راستہ روک رکھا تھا، کار نیچے اتر گئی۔ محمد خان نے جب دیکھا کہ ملٹری پولیس کی ٹارچ تعاقب میں قریب آ گئی ہے تو وہ پچھلی سیٹ سے اٹھا اور ہاتھ لمبا کر کے کار کی چابی گھما کر انجن بند کر دیا۔ کرنل جانسن نے گھبرا کر پوچھا ـــ "یہ کیا ہے؟" ـــ اتنے میں کار رک گئی اور محمد خان نے ریوالور نکال کر سب کو ہینڈز اپ کا چیلنج کیا۔ کرنل جانسن کار سے

نکل کر بھاگ نکلا۔ اُس پر ریوالور کی گولیاں فائر کی گئیں۔ اُس نے جوابی فائر کیا لیکن ٹانگ میں گولی لگنے سے اُس نے ہتھیار ڈال دیئے اور دوڑ کر اُسے پکڑ لیا گیا۔

صوبیدار محمد خان کی سکیم بے مثال اور کامیاب تھی۔ کرنل جانسن کے متعلق پتہ چلا کہ وہ جرمن تھا اور ۱۹۲۲ء میں انگلینڈ میں غیر قانونی طور پر داخل ہوا اور پھر وہیں رہا۔ اُسے لوگ انگریز سمجھتے رہے غیر معمولی ذہانت کی بدولت اُسے برطانوی فوج میں کپتان کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ وہاں اس کا رابطہ جرمن جاسوسوں کے ساتھ تھا۔ چار سال گزرے اُسے ہندوستان بھیج دیا گیا تھا یہاں اُس نے جاسوسی کا ایک مقامی گروہ بنایا جس میں مسلمان میجر اور یہ ہندو لڑکی بھی شامل ہو گئے۔ کرنل جانسن کا کورٹ مارشل ہوا۔ اُسے عمر قید دے کر انگلینڈ بھیج دیا گیا تھا۔ ہندو لڑکی، اینگلو انڈین اور ہندو کا مقدمہ کبھی بھی کورٹ میں نہیں گیا۔ میرا خیال ہے کہ تحقیقات میں انہیں اذیتیں دے دے کر مار دیا گیا ہو گا۔

صوبیدار محمد خان کو پنجاب کے نہری علاقے میں ایک مربع زمین اور دو ہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا۔ مجھے فوج کی طرف سے ایک تعریفی خط کے ساتھ تین ہزار روپیہ نقد انعام دیا گیا اور دو ہزار روپیہ اپنے محکمے نے انعام دیا۔ ان انعامات سے اندازہ ہوتا تھا کہ جاسوسوں کا یہ گروہ بہت ہی خطرناک تھا۔ مجھے یہ نہیں بتایا گیا کہ گرفتاری تک وہ انگریزوں کو کتنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ محمد خان نے بھی کچھ نہیں بتایا تھا کیونکہ یہ فوجی راز تھا، ورنہ جاسوسوں کی گرفتاری کوئی ایسا کارنامہ نہیں سمجھا جاتا تھا کہ اس کے صلے میں انعام دیئے جاتے۔

مگر یہ انعام مجھے بہت مہنگا پڑا کیونکہ یہ کیس تو ختم ہو گیا لیکن اس سے ایک اور کیس نکل آیا جس نے میری جان بھی کھا لی۔ یہ تھا مسلمان میجر کا قتل۔ میں نے اس کی تفتیش سے جان چھڑانے کی ایک کوشش یہ کی کہ ملٹری انٹیلی جنس والوں سے کہا کہ مجھ پر یہ مہربانی کرو کہ مجھ سے تین ہزار روپیہ واپس لے لو، اس کے عوض یہ لکھ دو کہ اس میجر کو اس کے ساتھی جاسوسوں نے قتل کیا ہے مگر انگریز قانون کے معاملے میں دیانتدار ہوتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ تفتیش کر چکے ہیں۔ قتل کا جاسوسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

میرے لیے دوسری مشکل یہ پیدا ہو گئی کہ میجر مقتول کے باپ نے تھانے میں آ کر رپورٹ درج کرا دی کہ میرا بیٹا قتل ہو گیا ہے۔ اُس نے مقتول کے سسرال پر سنجیدہ شک کا اظہار کیا۔ ان حالات میں مجھے قتل کی تفتیش کرنی پڑی۔ یہ ایک ڈرامہ تھا جس نے مجھے جذباتی طور پر ہلا کے رکھ دیا۔

ایک کہانی ایک گناہ

ملٹری انٹیلی جنس اور ملٹری پولیس کے گورے اپنے ملزموں کو لے کر چلے گئے اور میرے لیے مسلمان میجر کی لاش چھوڑ گئے۔ انہوں نے مجھے آٹھ بجے صبح اپنے دفتر بلایا تھا۔ مجھے اتنی سی بھی مہلت نہ دی کہ میجر کی لاش کے متعلق ضروری کارروائی کر لیتا اور جائے واردات کا اور اس کے اردگرد کا معائنہ کر لیتا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ موقعہ واردات پر فوراً پہنچو تو کوئی نہ کوئی اشارہ، کھرا یا سراغ مل ہی جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ واردات پر نہیں سے پردے پڑتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے اپنے اے۔ایس۔آئی کو میجر کے بنگلے پر بلا لیا تھا۔ وہ رگھبیر سنگھ نام کا ایک راجپوت تھا۔ تفتیش کے معاملے میں دیانتدار تو نہیں تھا لیکن تفتیش کی باریکیوں کو خوب سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ میری عادات اور اصول سے بھی واقف تھا۔ میں نے اُسے "چائے پانی" سے کبھی نہیں روکا تھا لیکن سنگین وارداتوں میں اسے ہیراپھیری اور دشمنی کی اجازت کبھی نہیں دی تھی۔ مسلمان میجر کا قتل ایک سنگین واردات تھی۔ وہ فوراً بنگلے میں آگیا۔

اُسے ابھی معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر کیا گزری ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس کے انگریز افسروں کو اور میجر کی لاش دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے صبح آٹھ بجے ملٹری پولیس کے ہیڈکوارٹر میں جانا ہے جہاں سارا دن گزر جائے گا اس لیے وہ مقتول کی لاش کا پوسٹ مارٹم کرائے اور دیگر ابتدائی کارروائی مکمل کرے۔

اُس نے میری بات کاٹ کر مجھ سے پوچھا — "ان افسروں نے کیس سول پولیس کو دینے کے متعلق کوئی تحریر دی ہے؟ ... یہ کیس اُن کا ہے ہمارا نہیں۔ مقتول فوجی ہے اور فوجی بنگلے میں قتل ہوا ہے۔ یہ ملٹری پولیس کا کیس ہے۔"

میں نے کیس کا یہ پہلو تو سوچا ہی نہیں۔ میری جان میں جان آئی۔

میں نے انگریز میجر سے کہا — "یہ فوج کا کیس ہے۔ اس کی تفتیش ملٹری پولیس کرے گی۔ میں اس کی لاش نہیں اٹھاؤں گا۔"

"یہ کیس آپ کو ہی لینا پڑے گا" — انگریز میجر نے کہا — "ہم لوگ بہت مصروف ہیں۔ صبح یہ کیس تمہیں سرکاری طور پر مل جائے گا۔"

"ایف۔آئی۔آر (ابتدائی رپورٹ) پر کس کا نام ہوگا؟"

"میرا" — میجر نے جواب دیا — "رپورٹ بریگیڈ ہیڈکوارٹر کی طرف سے ہوگی۔ تمہیں رپورٹ اور سرکاری چٹھی صبح نو بجے

تک مل جائے گی۔ تفتیش فوراً شروع کردو۔"

میں اس کیس سے جان چھڑانے کی صورت نکال سکتا تھا لیکن ایک دیسی تھانیدار انگریز بادشاہ کے حکم کو ٹالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ دراصل یہ انگریز میجر میری ہی طرح اس کیس سے جان چھڑا رہا تھا۔ اس کے سامنے جاسوسی کی اس واردات کی بڑی لمبی اور پیچیدہ تفتیش تھی۔ کرنل جانسن اور اس کے ایک ہندو اور ایک اینگلو انڈین ساتھی کو ملٹری پولیس نے میرے اغوا میں پکڑا تھا، جاسوسی کی تفتیش انہیں ابھی کرنی تھی۔ اس لیے وہ میجر قتل کی تفتیش میرے سر ڈال رہا تھا۔

میں نے سرکاری حکم نامے کے انتظار میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ رگھبیر سنگھ سے کہا کہ وہ لاش کے ارد گرد غور سے دیکھے۔ تمام کمروں کو دیکھے۔ صوبیدار محمد خان کے بیان کے مطابق ایک آدمی اندر سے نکلا اور دائیں طرف دوڑ کر فصیل پھلانگ گیا تھا۔ رگھبیر سنگھ کو میں نے ہدایت دی کہ وہ کھرے تلاش کرے جہاں سے وہ آدمی فصیل کودا تھا اس جگہ کو دیکھے۔ کوئی چیز کتنی ہی بیکار کیوں نہ نظر آئے، اٹھا لے۔ اس طرح کی کچھ اور ہدایات دے کر میں نے کیس رگھبیر سنگھ کے حوالے کر دیا۔ وہ میرا انداز اور طریقۂ تفتیش سمجھتا تھا۔ پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ وہ کسی اہم سراغ کو نظر انداز نہ کر دے۔ ایسے سراغ ایک بار گم ہو جائیں

تو پھر ملا نہیں کرتے۔

وہ سارا دن ملٹری انٹیلی جنس کے ہیڈ کوارٹر میں گزر گیا۔ میرا بیان بڑا ہی طویل تھا۔ رات کو میں تھانے گیا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا۔ مقتول کے وارثوں کو اطلاع دی جا چکی تھی۔ لاش ان کے حوالے کر دی گئی تھی۔

تھانے میں مقتول کا بوڑھا باپ اور چھوٹا بھائی میرے انتظار میں بیٹھے تھے۔

میں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے رپورٹ لے آیا تھا۔ فوج سے کیس لینے کی کاغذی کارروائی مکمل کرا لی تھی۔ میں نے ملٹری پولیس سے یہ ضمانت بھی لے لی تھی کہ مجھے کسی بھی وقت کتنے ہی بڑے انگریز یا ہندوستانی فوجی افسر کی ضرورت برائے تفتیش پڑے تو کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ کرنل جانسن کے ساتھ میرا تجربہ تکلیف دہ ثابت ہوا تھا۔ ملٹری پولیس نے مجھے یقین دلایا کہ اگر میں بریگیڈ کمانڈر کو بھی تھانے میں بلانا چاہوں تو وہ آ جائے گا۔

ملٹری پولیس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ جاسوسی کے ملزموں یعنی کرنل جانسن، ہندو لڑکی، ان کے ایک ہندو اور ایک اینگلو انڈین ساتھی سے مقتول کے قتل کی تفتیش بھی کریں گے مگر وہ وثوق کے ساتھ کہتے تھے کہ قتل کی واردات کا تعلق جاسوسی کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا۔

مجھے ملٹری پولیس پر انحصار نہیں کرنا چاہیئے تھا اور نہ ہی میں نے کیا کیونکہ ان کی توجہ جاسوسوں کے گروہ پر مرکوز تھی۔ میں نے مقتول کے باپ اور بھائی سے اپنی تفتیش کی بسم اللہ کر دی دونوں اُس وقت جذبات کے غلبے میں تھے۔ رو رہے تھے۔ اس ذہنی حالت میں اُن کی ہر بات کو اہمیت نہیں دی جا سکتی تھی وہ قتل کا تمام تر الزام مقتول کے سسرال پر اور ارشد پر عائد کر رہے تھے۔ مجھے جہاں تک علم تھا، ارشد اور مقتول کی بیوی نے دوستی کا ڈرامہ کھیلا تھا تاکہ میجر (مقتول) راہ پر آجائے اور ہندو لڑکی سے تعلقات توڑ دے لیکن مقتول کا باپ یقین سے کہتا تھا کہ بیوی دو اڑھائی مہینوں سے اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ارشد نام کے ایک آدمی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔ ساری برادری جانتی ہے ارشد کے متعلق مقتول کے باپ نے بتایا کہ اچھے کردار کا آدمی نہیں۔ اس کا بیوی سے اکثر جھگڑا چلتا رہتا ہے۔ وہ بیوی کو پسند نہیں کرتا۔ مقتول کے سسرال کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ مقتول پر بدکاری اور شراب خوری کے جھوٹے الزام عائد کرکے اپنی بیٹی کی طلاق لینا چاہتے تھے۔ مقتول طلاق نہیں دینا چاہتا تھا اس لیے قتل کر دیا گیا۔

"کیا مقتول کا چال چلن اچھا تھا؟" — میں نے پوچھا — "وہ شراب نہیں پیتا تھا؟"

"وہ تو جی بڑے ہی اچھے چال چلن کا آدمی تھا" — باپ نے جواب دیا — "وہ تو سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ آپ شراب کی بات کرتے ہیں۔"

"تانگے میں کون آیا؟ — گیا کہاں؟"

میں مقتول کو اچھی طرح جانتا تھا۔ آپ کو بتا چکا ہوں کہ اُس کا چال چلن کیسا تھا۔ میں نے اس کے باپ کی الزام تراشی پر زیادہ دھیان نہیں دیا۔ البتہ ارشد اور مقتول کی بیوی کے تعلقات کے متعلق اس نے جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ میں نے ذہن میں نوٹ کر لی۔ اس سے چند اور ضروری باتیں پوچھیں اور رات کو نہایت احتیاط سے ایف۔ آئی۔ آر تیار کی۔ باپ اور بھائی کو گھر بھیج دیا اور رگھبیر سنگھ سے رپورٹ لینے بیٹھ گیا۔

اُس نے میری ہدایات پر نہایت چابکدستی سے عمل کیا تھا۔ لاش پر تیز دھار آلے (خنجر یا چاقو) کے چھ گہرے زخم تھے۔ تین سینے میں جس سے پھیپھڑے کٹ گئے تھے۔ ایک جگر میں، ایک معدے میں اور چھٹا زخم ناف سے ایک انچ بائیں طرف

تھا جس سے اندر یا باہر کا راستہ نہیں تھا۔ اُس رات مقتول نے اپنے اردلی اور خانساماں کو چھٹی دے دی تھی اس لیے یہ معلوم کرنا ممکن نہ تھا کہ مقتول اس رات بنگلے میں داخل ہوا تو تب کون کون بنگلے میں تھا۔

رگھبیر سنگھ کے جائزے کے مطابق بنگلے میں کوئی چیز بے ترتیب نہ تھی۔ کسی کمرے میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں تھی۔ البتہ باہر سے کچھ کام کی چیزیں ملی تھیں۔ ان میں ایک تو قاتل کا کھرا تھا۔ وہ بنگلے سے دائیں طرف کو جاتا اور فصیل پھلانگی تھی۔ بنگلے اور فصیل کے درمیان بیس گز کا فاصلہ تھا۔ راستے میں باغیچہ تھا جو تقریباً ویران تھا۔ اس کی زمین کچی تھی۔ کھرے دو پاؤں کے نشان واضح تھے۔ یہ شوز تھے۔ دائیں پاؤں کی ایڑی کے دائیں طرف تھوڑا سا چمڑا الگ لگا ہوا تھا جو ظاہر کرتا تھا کہ وہاں سے ایڑی گھس گئی تھی۔ بائیں ایڑی ٹھیک تھی۔ بعض لوگ دایاں یا بایاں پاؤں ٹیڑھا رکھتے ہیں۔ یہ آدمی دایاں پاؤں ٹیڑھا رکھنے والا تھا۔ رگھبیر سنگھ نے دونوں پاؤں کے کھروں کے ناپ لے کے باقاعدہ ثبت کر دیا تھا۔

فصیل یعنی بنگلے کے ارد گرد کی دیوار ڈیڑھ گز اونچی تھی۔ کھرے رگھبیر سنگھ کو اس جگہ لے گئے جہاں سے قاتل نے فصیل پھلانگی تھی۔ دوسری طرف بھی کھرے صاف تھے۔ وہاں سے

رگھبیر سنگھ نے زمین پر پاؤں یا ہاتھ پر اس کے چھاپے لیے تھے۔ کھروں کے مطابق قاتل آٹھ دس قدم فصیل کے ساتھ ساتھ گیا۔ وہاں بھی زمین کچی تھی اور رات کو اوس بھی خوب پڑی تھی جس نے کھروں کو واضح کر دیا تھا۔ رگھبیر سنگھ نے کسی کھوجی کی مدد کے بغیر کھرا خود ہی اٹھا لیا تھا۔

قاتل وہیں سے ہٹ کر سڑک تک گیا جہاں اس کے کھرے ختم ہوتے۔ وہاں ایک تانگے کے پہیوں کے نشان تھے۔ گھوڑے کے کھرے بتاتے تھے کہ یہاں تانگہ کھڑا رہا ہے۔ وہ تانگوں کا زمانہ تھا۔ تانگے کے پہیوں اور گھوڑے کے کھروں کے بھی نشان سڑک کے باہر تھے۔ وہاں بھی تانگہ سڑک سے اتر کر کھڑا رہا تھا۔ رگھبیر سنگھ نے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے ہی اس سڑک کی ناکہ بندی کر لی تھی۔ کسی کو ادھر سے گزرنے نہ دیا، اس لیے کھرے محفوظ رہے۔

تانگے کے پہیوں کے نشان اتنے صاف تھے کہ ایک نشان میں ایک بڑی واضح چیز نظر آئی۔ وہ یہ تھی کہ پہیے پر جو ربڑ چڑھا ہوا ہوتا ہے اس میں تقریباً پون انچ خلا تھا یعنی ربڑ کے سرے آپس میں ملے ہوئے نہیں تھے۔ قاتل کے کھروں اور تانگے کے پہیوں نے اپنی خاموش زبان میں بتایا کہ قاتل فصیل پھلانگ کر سڑک کی طرف گیا تو تانگہ جو وہاں

کے پار کچے میں کھڑا تھا گھوم کر اس طرف آ گیا۔ تا تل تانگے بیٹھا اور چلا گیا۔ وہیں سے تانگے پر چڑھ گیا تھا، اس لیے کے پہیوں کے نشان بھی غائب ہو گئے۔ مجھے اب یہ معلوم تھا کہ تانگہ کہاں گیا اور اس میں کون آیا اور گیا۔

ضرورت یہ تھی کہ اس تانگے کو تلاش کیا جاتا۔ اس کی نشانی صرف یہ تھی کہ اس کے ایک پہیے کے ربڑ میں آدھ اِنچ خلا تھا لیکن یہ کام پتھر سے دودھ نکالنے کے برابر تھا۔ تانگوں کے ربڑوں میں اتنے خلا تو ہوتے ہی ہیں۔ اس کے علاوہ اتنی بڑی چھاؤنی اور شہر میں تانگوں کا کوئی شمار نہ تھا۔ ایک تو شہر اور چھاؤنی کے تانگے تھے۔ دوسرے مضافاتی علاقوں سے آنے جانے والے تانگے تھے اور تیسرے پرائیویٹ تانگے تھے۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس زمانے میں ٹیکسیاں عام نہیں ہوئی تھیں اور پرائیویٹ کاریں بھی تھوڑی تھیں۔ زیادہ لوگ تانگہ سواری کرتے تھے۔ بڑے بڑے افسر بھی سواری کے لیے تانگہ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ میں ایسے تانگے کی تلاش میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جس کی کوئی واضح نشانی نہیں تھی۔

میرے پاس تین چابیاں، ملزم کا کھرا اور تانگے کے ربڑ کا نشان رہ گیا تھا۔ باقی سب اندھیرا تھا۔ رگھبیر سنگھ نے

مجھے پریشان دیکھا تو ہنس کر بولا — "ملک صاحب! سنا ہے افریقہ کے جادوگر کچھ پڑھتے ہیں اور ملزم کھچا ہوا سامنے آ جاتا ہے۔ مجھے افریقہ بھجوا دیں۔ وہ علم سیکھ آؤں گا۔"

حقیقت یہی تھی کہ مجھے حبشیوں کے کالے علم کی ضرورت تھی۔ جسے انگریزی میں "وِچ کرافٹ" کہتے ہیں۔ میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ دن بھر ملٹری پولیس بیان ریکارڈ کرتی رہی تھی۔ دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ جسم اس لیے دُکھ رہا تھا کہ جاسوسوں کا ٹولہ میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر کار میں اس طرح ڈال کر دریا میں پھینکنے کے لیے لے گیا تھا جیسے میں بیکار سامان سے بھرا ہوا بکس تھا۔ میں کار کے فرش پر پڑا تھا اور جب کار کچے میں گئی تو اچھل اچھل کر اس نے میری ہڈیاں توڑ دی تھیں۔ اب دوسری رات بھی جاگتے گزر رہی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے رگھبیر سنگھ سے کہا کہ آؤ یہ سمجھ کر سو جائیں کہ کوئی میجر قتل نہیں ہوا۔ میں نے سب سے کہا — "اگر ایک درجن میجر قتل ہو جائیں تو بھی مجھے نہ جگانا۔"

میں گھر جا کر سو گیا۔ صبح سویرے ہی آنکھ کھل گئی۔ ذمہ داری کا احساس سونے کہاں دیتا ہے۔ میرے سامنے جو ممکنہ ملزم تھے، اُن کی ترتیب یوں بنتی تھی۔ سب سے پہلے جاسوسوں کا ٹولہ تھا جسے ملٹری انٹیلی جنس اور صوبیدار محمد خان نے یہ یقین دلانے

کی پوری کوشش کی تھی کہ قتل کی واردات کا جاسوسوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں مگر میں اس گروہ کو نظر انداز نہیں کر تھا۔ کچھ وجوہات ایسی تھیں جن کی بنا پر یہ گروہ میجر کو قتل کر سکتا تھا۔ میجر نے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دی تھی کہ اقبالِ جرم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے عوض اُس نے سلطانی گواہ بننے کی میری پیشکش قبول کی تھی۔

سر بیدار محمد خان نے مجھے بتایا تھا کہ مقتول نے مجھے یہ اس سازش کے سلسلے میں دیا تھا کہ میں مقتول کے بنگلے میں جاؤں گا تو مجھے اغوا کر لیا جائے گا۔ اس کے باوجود مجھے شک تھا کہ جانسن نے اس شک کی بنا پر کہ میجر اسے دھوکہ نہ دے جائے اسے قتل کرا دیا ہے اور سر بیدار محمد خان اس سے بے خبر ہے اپنا شک رفع کرنے کے لیے مجھے جاسوسی کے چاروں ملزموں سے پوچھ گچھ کرنی تھی۔

مشتبہ فہرست میں ارشد اور مقتول کی بیوی کو میں نے دوسرے نمبر پر رکھا۔ انہوں نے یہ بیان دیئے تھے کہ وہ بوڑھے بہن بھائی ہیں۔ انہوں نے مقتول کو راہِ راست پر لانے کے لیے اسے یہ جھوٹا تاثر دیا ہے کہ ان کا ناجائز رشتہ ہے مگر اب مجھے شک ہونے لگا تھا کہ تاثر حقیقی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے مقتول کی بیوی جوان تھی اور اس میں عجیب سی کشش

تھی اور ارشد زندہ دل انسان تھا۔

مجھے ہندو لڑکی پر بھی شک تھا۔ وہ اپنے حسن اور اثر و رسوخ کی بدولت مقتول کو اس بنا پر قتل کرا سکتی تھی کہ اس کے پیچھے مقتول نے پولیس کو ڈالا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کرنل جانسن اور ہندو لڑکی نے اپنے گروہ کے کسی اور ممبر کو بتائے بغیر مقتول کو قتل کرا دیا ہو۔

پھر مجھے ہندو لڑکی کے باپ پر بھی شک تھا۔ اس ہندو کے دل میں مقتول میجر کے خلاف عناد موجود تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مقتول نے اس کا اٹھانوے ہزار کا بل روک رکھا تھا جو نادن ہزار کا ہونا چاہیئے تھا۔ اس ہندو ٹھیکیدار کو یہ ڈر ہوگا کہ میجر (مقتول) اس کی بددیانتی کی رپورٹ کر کے اس کی ٹھیکیداری بلیک لسٹ کرا دے گا۔ عناد کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اُس کی بیٹی کے ساتھ مقتول کے ناجائز تعلقات تھے اور اس نے لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ میں جس واحد شخص پر شک کا اظہار کیا تھا وہ مقتول تھا حالانکہ اس کے پاس اس شک کا کوئی جواز نہیں تھا۔

میں نے سب سے پہلے ہندو ٹھیکیدار کو تھانے بلایا۔ یہ تو میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ قتل اس نے خود نہیں کیا نہ ہی ہندو میں اتنی جرأت ہوتی ہے۔ اس نے کرائے کا قاتل استعمال کیا ہوگا۔ میں نے چار گھنٹے اس پر ایسی جرح کی کہ اُس نے فی الواقع میرے

پاؤں پکڑ لیے اور بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے اسے یہ شک نہیں ہونے دیا کہ مجھے اس پر قتل کا شک ہے۔ اس نے اس جرح کے دوران کوئی بیس مرتبہ پوچھا ـــ "میری بیٹی کہاں ہے؟" ـــ میں نے ہر بار اُسے ٹال دیا۔

اُس نے صرف یہ اعتراف کیا کہ مقتول نے اس کا جو بل روکا ہوا تھا وہ واقعی ستاون ہزار کی بجائے اٹھانوے ہزار روپوں کا تھا لیکن میجر نے یہ بل دیانتداری کی وجہ سے نہیں روکا تھا۔ وہ رشوت بہت زیادہ مانگ رہا تھا اور ہندو ٹھیکیدار اتنی زیادہ رشوت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہندو نے یہ بھی تسلیم کیا کہ اس نے لڑکی کی گمشدگی کی رپورٹ میں مقتول کا نام شامل کر کے اسے دھمکی دی تھی کہ وہ مقتول کو گرفتار کرا دے گا۔ اس سے بڑھ کر اُس نے کچھ اور نہیں سوچا تھا، نہ کیا تھا۔ اپنی بیٹی کے متعلق اس نے بتایا کہ اس لڑکی کا دوستانہ کئی ایک انگریز فوجی افسروں کے ساتھ تھا۔

یہ ہندو ابھی تھانے میں ہی تھا کہ ملٹری پولیس کا ایک کیپٹن اور چار گورے آ گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ ہندو ٹھیکیدار کون سا ہے۔ وہ اس کے گھر گئے تھے۔ وہاں سے انہیں پتہ چلا تھا کہ ہندو کو تھانے میں بلایا گیا ہے، چنانچہ وہ میرے پاس آ گئے اور مجھ سے یہ پوچھ کر کہ اگر مجھے اس کی

مزید ضرورت نہ ہو تو اسے لے جائیں۔

وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

اُس کی بیٹی جاسوسی کے الزام میں پکڑی ہوئی تھی۔ لہٰذا اس سے پوچھ گچھ لازمی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میجر کے قتل کے ساتھ اس شخص کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر بھی میں نے اپنے اے۔ایس۔آئی رگھبیر سنگھ سے کہا کہ وہ اس ٹھیکیدار کی فرم کے تمام ملازمین کی فہرست دیکھے۔ خصوصاً مزدوروں کی فہرست۔ پھر ان سب سے مل کر یہ معلوم کرے کہ ان میں کوئی ہسٹری شیٹر یعنی عادی جرائم پیشہ تو نہیں جس پر یہ شک کیا جا سکے کہ وہ کرائے کا قاتل ہو سکتا ہے۔

رگھبیر سنگھ اُسی وقت روانہ ہو گیا اور میں مقتول کے بنگلے میں چلا گیا۔ میں مقتول میجر کے اردلی اور خانساماں سے ملنا چاہتا تھا۔

وہاں مقتول کے کچھ لواحقین موجود تھے۔ میں نے اردلی اور خانساماں کو الگ کر لیا۔ خانساماں سے میں قتل سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ اردلی کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ انہوں نے بتایا کہ میجر (مقتول) نے انہیں شام کا کھانا جلدی دینے کو کہا اور پانچ پانچ روپے دے کر انہیں کہا کہ میں کھانا کھا چکوں تو وہ رات بھر کے لیے چھٹی کریں۔ نوکر چاکر چھٹی اور انعام سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کی بلا سے انہیں چھٹی کیوں دی جا رہی ہے۔ وہ چلے گئے۔ صبح واپس آئے تو میجر قتل ہو چکا تھا۔

میں نے اُن کے کوارٹروں میں جا کر اُن کے جوتے دیکھے۔ وہاں جتنے تالے تھے وہ دیکھے۔ ان میں کوئی جوتا ملزم کے کھُرے سے نہیں ملتا تھا اور نہ ہی اُن کے کسی تالے میں اُن تین چابیوں میں سے کوئی چابی لگتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ میجر عیاش آدمی تھا۔ ہندو لڑکی اس کے پاس اکثر آتی تھی۔ وہ شراب پیتے تھے۔ میجر کی بیوی بُرا مانتی تھی۔ پھر ایک آدمی (ارشد) میجر کی غیر حاضری میں اس کی بیوی کے پاس آنے لگا۔ غرض اردلی اور خانساماں نے کوئی نئی بات نہیں بتائی۔ انہوں نے جو بتایا وہ میں آپ کو اس سے پہلے تفصیل سے سنا چکا ہوں۔ ارشد اور میجر کی بیوی کے تعلقات کے متعلق دونوں نے یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں بتایا، سوائے اس کے کہ ایک بار ارشد اور میجر کا زبانی جھگڑا ہوا تھا۔

بارُود خانے کا بھید ــ جرمن کرنل اور ہندو لڑکی

میں نے واردات کا کمرہ دیکھا۔ رگھبیر سنگھ نے کمرہ بند کروا رکھا تھا اور وہاں ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا تو میرے جسم نے جھرجھری سی لی۔ یہیں میں نے میجر کو زندہ اور سلامت دیکھا تھا۔ یہیں اس کی لاش دیکھی تھی اور یہیں سے مجھے رسّیوں میں جکڑ

کر اور میرے منہ پر کپڑا باندھ کر وہ لوگ اُٹھا لے گئے تھے۔

اس کمرے کی چیزیں یہ بتانے سے عاری تھیں کہ یہاں کے رہنے والے کو کس طرح قتل کیا گیا ہے۔ کیا اُس نے قاتل کا مقابلہ کیا تھا؟ کیا قاتل نے اُسے بے خبری میں دبوچ لیا تھا؟ قاتل کون تھا؟ کیسا تھا؟ اُس کی کوئی نشانی، کوئی سراغ؟ کمرے میں موت کی دہشت اور خون کی بُو تھی۔

میں یہ سوچنے لگا کہ اس کمرے میں رشوت کی دولت اور شراب نے نہ جانے کتنے گناہ کرائے ہوں گے۔ وہاں مجھے اس ڈرامے کا آخری منظر سنانے والا کوئی نہ تھا۔ ساتھ والے کمرے میں کوئی عورت بین کر رہی تھی۔ شاید مقتول کی ماں تھی۔ فلور لیمپ کا بلب ابھی تک جل رہا تھا۔ فرش پر میجر کا خون جم گیا تھا۔ یہ اُس مسلمان کا خون تھا جس نے ایک انگریز کرنل اور ایک ہندو لڑکی کے ساتھ دوستانہ کیا تھا۔

میں اس کمرے سے نکلا۔ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تھانے چلا جائے۔ مقتول کے لواحقین سے کہا کہ وہ اب کمرے میں جا سکتے ہیں اور اس کی صفائی بھی کر سکتے ہیں۔ پولیس کو اس کی ضرورت نہیں۔ میں بنگلے سے نکلا اور ملزم کے بھاگنے کا راستہ فصیل تک دیکھا اور پھر شام ہو گئی۔ تھانے گیا اور سوچنے لگا کہ کون سی لائن اختیار کروں۔ بار بار ذہن جاسوسی کے ملزموں کی طرف جاتا تھا۔

میں چابیوں کا چھلّہ جس میں تین چابیاں تھیں اور جو فصیل کے قریب سے برآمد ہوا تھا، جیب میں ڈال کر کرنل جانسن کے بنگلے میں چلا گیا۔ کرنل جانسن خود تو قاتل نہیں ہو سکتا تھا، مجھے اس کے خانساماں پر شک تھا۔ بنگلے میں فوجی گارد ڈیوٹی پر تھی۔ میرے پاس بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا اجازت نامہ تھا کہ میں چھاؤنی میں ہر جگہ، ہر دفتر اور ہر یونٹ میں جا سکتا ہوں اور جسے چاہوں تفتیش کے لیے پکڑ سکتا ہوں۔ گارد کمانڈر نے چٹھی دیکھ کر مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے خانساماں کے کوارٹر میں جا کر اس کے جوتے دیکھے۔ اس کے پاس دو تالے تھے۔ میں نے اس سے سوال پوچھے۔ وہ بالکل صاف نظر آتا تھا۔ میں نے اس سے یہ بھی پوچھا کہ کرنل کے پاس اور کون کون آتا تھا اور کیا ان میں کوئی مشکوک قسم کا آدمی بھی ہوتا تھا؟ خانساماں نے بتایا کہ کرنل کے پاس متعدد لوگ آتے تھے۔ خانساماں ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔

اس کے بعد ملٹری پولیس نے میرے تین دن ضائع کر دیے۔ تین دن انگریزی بولتے گزر گئے کیونکہ ملٹری پولیس کے افسر انگریز تھے۔ کبھی وہ مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتے اور کبھی تھانے میں آ جاتے۔ انہوں نے بتایا کہ کرنل اور ہندو لڑکی نے یہ اعتراف کر لیا ہے کہ وہ جرمنی کے لیے جاسوسی کرتے تھے لیکن وہ جاسوسی کا طریقہ نہیں بتا

رہے، نہ ہی وہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس قسم کی جاسوسی کر چکے ہیں اور نہ ہی اپنے پورے گروہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ملٹری پولیس کو یہ شک تھا کہ یہ گروہ جاپانیوں کے لیے بھی جاسوسی کرتا ہے۔ اسی عرصہ میں جاپان نے ایسا زوردار حملہ کیا تھا کہ بحرالکاہل کے تمام جزیروں پر قبضہ کر کے اُس کی فوجیں برما میں داخل ہو گئی تھیں۔ ہندوستان خطرے میں آ گیا تھا۔ ملٹری انٹیلی جنس جانتی تھی کہ جاپانیوں نے ہندوستان میں جاسوسوں کا جال بچھا رکھا ہے اور اس سلسلے میں جاپانیوں کو جرمنی کی مدد حاصل ہے۔ یہ تو انگریز تسلیم کرتے تھے کہ جرمنوں کا جاسوسی کا نظام اس قدر اعلیٰ اور مستحکم ہے کہ جاسوسوں کے کسی رنگ کے ایک یا دو ممبر گرفتار کیے جا سکتے ہیں مگر پورے رنگ کو توڑنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

کرنل جانسن کا گروہ بھی کسی بہت بڑے رنگ کا حصّہ معلوم ہوتا تھا۔ ملٹری پولیس مجھ سے صرف سوال و جواب نہیں کرتی تھی بلکہ یہ انگریز افسر تفتیش اور سراغرسانی میں مجھ سے راہنمائی بھی لیتے تھے۔ میں انہیں تفتیش کے بنیادی اصول اور اپنا طریقہ کار بتاتا تھا مگر میری مجبوری یہ تھی کہ ملٹری انٹیلی جنس کی مجھے ذرّہ بھر ٹریننگ نہیں ملی تھی۔ تاہم میں ان کی مدد کرتا رہا اور میرا اپنا کیس یعنی مسلمان مینجر کا قتل چوپٹ ہوتا رہا۔ بہرحال یہ گورے

کوئی ایسے اناڑی تو نہیں تھے۔ ان میں ایک سکاٹ لینڈ یارڈ کا تربیت یافتہ تھا مگر ان کے لیے مشکل یہ تھی کہ ہندوستانی ماحول کو اچھی طرح نہیں سمجھتے تھے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ ان چاروں ملزموں سے میجر کے قتل کا سراغ لینے کی بھی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ مجھے ان چاروں سے ملنے کی اجازت دیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئے لیکن میں نے ان کی جو مدد کی تھی، اس کے عوض انہوں نے مجھے اجازت دے دی اور اگلے روز آنے کو کہا۔

میں گیا تو مجھے چھاؤنی کی ایک ایسی عمارت میں پہنچا دیا گیا جسے شہر کے لوگ بارود خانہ کہا کرتے تھے۔ یہ انگریزوں کی تعمیر کی ہوئی بہت پرانی عمارت تھی۔ بارشوں نے اس کی دیواریں سیاہی مائل کر دی تھیں۔ یہ کئی کمرے تھے۔ درمیان میں ایک گنبد سا بنا ہوا تھا۔ ارد گرد خاردار تار تھے۔ لوہے کا گیٹ تھا جو ہمیشہ مقفل رہتا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ اس کے اندر اژدہا ہے۔ اسی لیے اسے بارود خانہ کہا جاتا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس میں ریزرو ایمونیشن ہوگا مگر جنگ کے دوسرے سال تک بھی اس پُراسرار عمارت سے بارود نہیں نکالا گیا تھا۔

ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انگریزوں نے مسلمانوں کے بہت سے لیڈروں کو ان کی بیویوں

اور بچوں سمیت یہاں لا کر بند کر دیا تھا۔ پھر یہ عمارت کبھی بھی نہیں کھولی گئی۔ بدنصیب اور معصوم قیدی اندر بھوکے پیاسے مر گئے اور اب اندر ان کی ہڈیاں پڑی ہیں۔ قیدیوں کی کم سے کم تعداد تین سو بتائی جاتی تھی۔ بعض لوگ ایک ہزار بھی بتاتے تھے۔ بہرحال یہ عمارت شہریوں کے لیے معمہ اور پُراسرار بنی ہوئی تھی۔

مجھے جب وہاں لے جایا گیا تو اسرار کا دروازہ کھلا تھا۔ بڑے گیٹ پر ایک گورا سپاہی رائفل لیے کھڑا تھا۔ خاردار تاروں کے اندر ملٹری پولیس کی گاڑی کھڑی تھی۔ بہت سے فوجی گورے اُدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ باہر ایک بنچ پر پانچ سویلین آدمی بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے ایک گورا سپاہی رائفل اٹھائے کھڑا تھا۔ یہ جاسوسی کے مشتبہ افراد تھے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ پانچوں چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

میری آمد کی اطلاع اندر گئی تو وہ انگریز میجر اندر آیا جس نے میرے اغوا کے دوران کرنل جانسن اور اس کے گروہ کو پکڑا تھا۔ وہ مجھے دوستانہ طریقے سے ملا۔ اُس نے مجھے کہا — "تم چاروں سے مل سکتے ہو لیکن یہاں تمہیں جو کچھ نظر آتے اس کا ذکر اس گیٹ سے باہر کسی سے نہ ہو" — اندر لے جا کر اس نے مجھے ایک کمرہ دکھایا اور کہا — "اس میں کرنل ہے۔ اس سے مل کر میرے پاس آ جانا۔"

میں کمرے میں داخل ہوا۔ چھت جالوں میں چھپی ہوئی تھ
صرف ایک کھڑکی تھی جو بند تھی۔ یہ بھی جالوں سے ڈھکی ہو
دیواریں سیاہی مائل تھیں۔ کمرے میں عجیب سی بدبو تھی۔ فرش
سیم زدہ تھا۔ یہ کمرہ یقیناً ایک صدی بند رہا تھا۔ کمرہ فرا
ایک دیوار کے ساتھ لکڑی کا بنچ پڑا تھا جس پر کرنل جانسن
تھا۔ اُس کے جسم پر وہی کپڑے تھے جو اُس نے میرے اغو
رات پہنے ہوئے تھے۔ اس کی پتلون خون آلود تھی۔ اس
ٹانگ میں ریوالور کی گولیاں لگی تھیں۔ اُس رات جب وہ پکڑا
تھا اسے ہسپتال لے گئے تھے لیکن معلوم ہوا کہ اُسے ہسپتال
میں داخل نہیں کیا گیا۔ پٹی باندھ کر اُسے اس کمرے میں لے آ
تھے۔ یہی وہ کرنل جانسن تھا جسے میں اُس کے بنگلے میں پہلی
ہندو لڑکی کے اغوا کے سلسلے میں ملنے گیا تو اس نے مجھے دھتکا
کر بنگلے سے باہر نکال دیا تھا۔ اُس نے بادشاہوں کی طرح میرے
ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔

اب میں اس بادشاہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ لکڑی کے بنچ پر بیٹھا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے غلیظ تھے۔ پتلون خون آلود تھی اور اس کا چہرہ سوکھ کر زرد ہو گیا تھا۔ اس نے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا رکھی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مر چکا ہو یا مر رہا ہو۔ اس کی آنکھیں بند

ں۔ یہ بھوک، پیاس، شب بیداری اور جسمانی اذیت (تھرڈ
ی) کے اثرات تھے۔ مجھے دیکھ کر اُس نے آنکھیں ذرا سی
لیں۔

میں نے اُس کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "آپ کو اس حالت میں
ھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے"۔

اُس نے سر دیوار کے ساتھ لگا رکھا تھا۔ ذرا سا چہرہ گھما کر اُس نے
دیکھا اور پوچھا۔ "تمہیں بھی ان لوگوں نے بلا لیا ہے؟ تم کیا
چھنا چاہتے ہو؟ مجھے جو کچھ معلوم تھا بتا چکا ہوں"۔

"ملٹری پولیس کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں"۔ میں نے اُسے
۔ "میں مسلمان میجر کے قتل کی تفتیش کے لیے آیا ہوں"۔

"پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟"

"اُسے کس نے قتل کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی ایسے قاتل نے جسے میں نہیں جانتا"۔ کرنل جانسن
ے جواب دیا۔

چند اور سوال جواب ہوئے۔ آخر کرنل جانسن نے کہا۔ "ملٹری پولیس ہر تین گھنٹے بعد مجھ سے یہی سوال پوچھتی ہے جو تم نے پوچھا ہے۔ مسلمان میجر کو میں نے قتل کیا ہے نہ کرایا ہے۔ ایسے اقدام کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں تمہارے اغوا میں موقعہ پر گرفتار ہوا تھا۔ ہندو لڑکی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور میرے گروہ کے دو اور آدمی

بھی پکڑے گئے۔ لڑکی نے سب سے پہلے اقبالِ جرم کیا جو مجھے د
تو میں نے بھی اقبالِ جرم کر لیا۔ میں نے مان لیا کہ میں جرمنیٔ
ہوں۔ اب میرے لیے سزائے موت ہے جو ٹل نہیں سکتی۔ اگر م
کے قتل کا بھی اعتراف کر لوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے ا
قتل کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو میرا وفادار ساتھی تھا۔ اُس
میری سکیم کے مطابق تمہیں اپنے گھر بلانے کے لیے اقبالِ ج
اور سلطانی گواہ بننے کا جھانسہ دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میر
محمد خان نے برباد کر دی۔ میں یہ رائے بھی نہیں دے سکتا کہ
کس نے قتل کیا ہے۔ بہر حال یہ ہمارا کام نہیں تھا...."

وہ بڑی ہی نحیف آواز میں بول رہا تھا۔ اُس نے مجھ سے
مانگا۔ میں نے کبھی سگریٹ یا حقہ پیا ہی نہیں۔ میں نے اُٹھ
کہا کہ لا دیتا ہوں۔

اُس نے مجھے روک دیا اور کہا "یہ لوگ تو مجھے پانی بھی نہ
ان سات دنوں میں انہوں نے مجھے صرف تین دفعہ ہندوستانی
دیا ہے۔"

میں پھر بھی میجر کے پاس چلا گیا اور اُس سے سگریٹ مانگا
نے پوچھا کہ خود پیو گے یا کرنل کو دو گے؟ میں نے اُسے بتا دیا
کو پلاؤں گا۔ میجر نے مسکرا کر ایک سگریٹ اور ماچس مجھے دے
اور کہا — "یہ تمہاری خاطر ہے۔"

کرنل جانسن سگریٹ دیکھ کر حیران ہوا۔ میرے منہ کی طرف دیکھنے
ا۔ میں نے اُسے کہا — "تم میرے ساتھ تعاون کرو۔ میں تمہیں
ں اذیت اور توہین سے آزاد کرا دوں گا۔"

اُس نے نفی میں سر ہلا کر کہا — "تمہارے ساتھ تعاون کر چکا
ں۔ میجر کے قتل کے سلسلے میں میرے ساتھ وقت ضائع نہ کرو۔
ے تم اذیت سے آزاد نہیں کرا سکتے۔ یہ لوگ مجھے کہہ رہے ہیں کہ
ں اپنا تمام تر بشن انہیں بتا دوں اور اپنا سارا گروہ پکڑوا دوں۔ یہ
ں کبھی بھی نہیں کروں گا۔ میں اپنے ملک سے اپنے ملک کی خاطر نکلا
ھا۔ میرے ملک کے سپاہی جنگ میں مر رہے ہیں۔ ان کی لاشیں
سارے یورپ میں بکھر رہی ہیں۔ میں اپنے محاذ پر لڑ رہا ہوں۔ میں
اپنے ملک کے ان جاں نثاروں کو دھوکہ نہیں دوں گا جو جانیں قربان
کر چکے اور کر رہے ہیں۔ میری قوم پہلی جنگِ عظیم کی شکست کا انتقام
لے کے رہے گی۔ سارے یورپ پر، برطانیہ اور افریقہ پر جرمنی کا جھنڈا
لہرائے گا۔ میں اپنے سپاہیوں کی طرح جان دے دوں گا۔ جرمنی
کے نام پر مر جاؤں گا، اپنے گروہ کو بے نقاب نہیں کروں گا۔ میرا رنگ
سارے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے۔ میں اپنے محاذ کو صرف اپنی
جان بچانے کی خاطر تباہ نہیں ہونے دوں گا۔ میں جرمن خون کی توہین
نہیں ہونے دوں گا۔"

اُس کی آواز ابتدا میں بالکل مری ہوئی تھی۔ اُس نے جب اپنے

ملک کی بات شروع کی تو اُس کی آواز میں جان آگئی جو میں نے پہلے
میں اُس کے بنگلے میں دیکھی تھی۔ وہ جو ایک لاش کی طرح بے حال
تھا، جوانوں کی طرح سیدھا ہو گیا۔ اس نے کہا — "انسپکٹر! تم
باتیں شاید سمجھ نہ سکو۔ تم غلامی میں پیدا ہوئے ہو۔ تم نہیں جا
قومی وقار کیا ہوتا ہے۔ تم کوئی قوم نہیں ہو۔ تمہارا کوئی ملک نہ
ہے۔ تم ایڑیاں جوڑ کر سلیوٹ کرنے یا جھک کر سلام کرنے کے عادی
اس لیے اس ہندو لڑکی نے اور میرے ان دونوں ہندوستانی سا
نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ میں نے انہی کی وجہ سے اقبالِ جرم کیا۔
لیکن اس میں صرف اپنی ذات کو بے نقاب کیا ہے۔ اپنے گروہ ک
بھر نقصان نہیں پہنچاؤں گا.... تم ان انگریزوں کے خلاف کیو
نہیں اٹھتے؟ کیا تم بالکل نہیں جانتے کہ آزادی کیا ہوتی ہے؟
خان نے مجھے اردلی بن کر دھوکہ دیا ہے۔ اُس نے انگریزوں سے ان
حاصل کرنے کے لیے یہ کام کیا ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ میرا گروہ اسے زند
نہیں چھوڑے گا۔ میرے گروہ کو جب پتہ چلے گا کہ ہمیں محمد خان نے گرفتار کر
ہے تو وہ اُسے ایسے طریقے سے قتل کریں گے کہ قاتل کا سراغ نہیں ملے گا"

مجھے لڑکی کے کمرے میں داخل کیا گیا

ایسی بہت سی باتیں ہوئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میجر کے قتل میں کرنل

لسن کا کوئی ہاتھ نہیں۔ البتہ صوبیدار محمد خان کے متعلق کرنل
، جو دھمکی دی تھی۔ وہ میں نے انٹیلی جنس کے میجر کو بتا دی اور
سے مشورہ دیا کہ تفتیش اور مقدمے کی کارگزاری سختی سے راز میں
یں ورنہ محمد خان مارا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ میں بھی مارا
ؤں۔

اس کے بعد مجھے اس گروہ کے ہندو ملزم کے کمرے میں داخل کر
گیا۔ میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں نے اُسے کس حال میں دیکھا۔
کمرہ اُسی طرح ہیبت ناک تھا جس طرح کرنل جانسن والا تھا۔
رے کے وسط میں پانی کا بڑا ٹب رکھا تھا۔ اس میں ہندو ملزم
کل ننگا بیٹھا تھا۔ ایک تو موسم سردیوں کا تھا، دوسرے یہ
ہ سرد تھا۔ گرم کپڑوں میں بھی سردی لگ رہی تھی۔ اس سردی
ں ہندو ملزم کو ننگا کر کے بٹھایا ہُوا تھا۔ کمرے کے کونے میں بجلی
پنکھا (ٹیبل فین) رکھا تھا جو پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ اس
منہ ملزم کی طرف تھا۔ ملزم کا رنگ نیلا ہو گیا تھا۔ وہ بُری طرح
ڑپ رہا تھا۔ ایک گورا سارجنٹ ہاتھ میں ڈنڈا لیے اس کے
پیچھے کھڑا تھا۔ چھ سات دنوں سے اس کا یہی حشر ہو رہا تھا۔

یہ سارجنٹ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سے پہلے اُس کے
ساتھ میری ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ میں کمرے میں داخل ہُوا تو سارجنٹ
نے مجھے کہا — "پہلے روز یہ کسی سوال کا جواب ہی نہیں دیتا تھا۔

تھرڈ ڈگری ٹارچر سے گزارا جارہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ انگریز افسر
کردار گورے سپاہیوں سے بہت بلند ہوگا لیکن اس میجر نے آنکھ ما
مجھے کہا —— "لڑکی کو اپنی تحویل میں سمجھو۔ تفتیش کے علاوہ جتنا وقت
اس کے ساتھ گزار سکتے ہو۔"

مجھے اس کا مذاق کچھ اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی میں صاحب بہادر کو
دینے کے لیے غلامانہ ہنسی ہنس پڑا۔ اس نے مجھے اشارے سے بتایا
چوتھا کمرہ ہے۔ اس کے سامنے کھڑے ہو جاؤ۔ اندر سے جب دو سپا
باہر آجائیں تو تم اندر چلے جانا۔

میں اُس کا شکریہ ادا کرکے چوتھے کمرے کے دروازے کے سا
ہوگیا۔ دروازہ بند تھا۔ اندر سے لڑکی کی دبی دبی، گھٹی گھٹی آوازیں
رہی تھیں۔ وہ انگریزی میں کہہ رہی تھی —— "خدا کے لیے مجھے چھوڑ
مجھے گولی ماردو۔" وہ بڑی ہی سخت اذیّت میں مبتلا تھی۔ میں اُس
آوازیں برداشت نہ کرسکا اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔ یہ برآمدہ نہیں
سامنے کمروں کے درمیان کاریڈور تھا۔ تاریک اور بدبودار۔

چند منٹ بعد دو قوی ہیکل گورے سپاہی کمرے سے نکلے۔ ان
جسم ہندوستانی پہلوانوں کی طرح سانڈوں جیسے تھے۔ وہ جھومتے ہوئے پر
چلے گئے۔ میں کمرے میں گیا۔ یہ کمرہ بھی جالوں کی بہتات سے ہولناک
ہلکی سی روشنی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ دوسروں کی نسبت یہ کمرہ چھوٹا
ایسے تنگ ہونے لگا جیسے یہ کمرہ نہیں غار ہے۔ لڑکی اینٹوں کے فرش

پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ اُس کے جسم پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ اُس کی آنکھیں
کھلی ہوئی تھیں۔ میں سمجھا وہ مرچکی ہے اور میں یہ بھی سمجھ گیا کہ یہ سانڈوں
جیسے گورے اس کے ساتھ کیا سلوک کر گئے ہیں۔

اُس نے مجھے دیکھا۔ اس میں شاید بولنے کی بھی طاقت نہیں رہی تھی۔
اُس نے اٹھنے کی بھی کوشش نہ کی۔ اُس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی۔ اتنی
خوبصورت اور جوان لڑکی ہڈیوں کا پنجر بن چکی تھی۔ عورت کا عورت ہونا
اُس کی بہت بڑی بدنصیبی ہوتی ہے اور مجبور یا مجرم عورت کی خوبصورتی تو
اُس کے لیے لعنت بن جاتی ہے۔ اس لڑکی کو بے حد شرمناک اذیّت
دی جارہی تھی۔

برہنہ لڑکی —— باپ کا گناہ

میں باہر نکل آیا اور میجر سے جاکر کہا کہ ایک کمبل دو، میں اس حالت
میں لڑکی کے پاس ایک سیکنڈ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ میجر نے قہقہہ لگا کر
کہا —— "تم مردہ دل ہندوستانی ہو۔" اُس نے ایک کمبل منگوا دیا جو میں
لڑکی کے کمرے میں لے گیا۔ وہ ابھی تک چت لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے کمبل اُس
پر ڈال کر اُسے اُٹھنے کو کہا۔ اگر میں اُسے سہارا نہ دیتا تو وہ اٹھ نہ سکتی۔
اُس نے کمبل اوڑھ لیا اور وہیں بیٹھی رہی۔

میں اُس کے پاس فرش پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ اُس کے کندھوں پر،

کہتا تھا کہ میں اُردو کے سوا اور کوئی زبان ہی نہیں جانتا۔ ا
انگریزی بھی بولتا ہے اور کہتا ہے کہ تھوڑی تھوڑی جرمن ز
بھی جانتا ہوں۔"

میں ایسے تشدد کا قائل نہیں تھا لیکن جاسوسی کی واردا
کی سراغرسانی بڑا ہی دشوار کام ہے۔ اس میں تشدد لازمی سمجھ
ہے مگر اتنے زیادہ تشدد کے باوجود یہ ہندو ملزم اس سے
کچھ بھی نہیں بتا رہا تھا جو اُس نے اقبالِ جرم میں لکھوایا تھا۔ ا
بھی یہی کہا جا رہا تھا کہ پورے گروہ کی نشاندہی کرو، ا
مِشن بیان کرو اور جاسوسی کا طریقہ بتاؤ۔ وہ کہتا تھا کہ کرنل ج
کے سوا کسی اور کو معلوم نہیں اور اُسے گروہ کے کسی اور مم
واقفیت نہیں۔

میں نے اس سے میجر کے قتل کے متعلق پوچھا۔ بہت جرح کی مگر
نے رو رو کر لاعلمی کا اظہار کیا اور وہی باتیں بتائیں جو کرنل جانسن بتا چ
اس نے بتایا کہ انہوں نے شہر کے ایک ہوٹل میں چائے کی دعوت
بہانے میٹنگ کی تھی جس میں کرنل جانسن، مقتول میجر، ہندو لڑکی
اور اینگلو انڈین (ایک اور ملزم) شامل تھے۔ صوبیدار محمد خان ا
میٹنگ میں نہیں تھا۔ اُسے اس گروہ نے اپنا آدمی سمجھا تھا۔ میٹنگ
میرے اغوا اور قتل کی سکیم تیار ہوئی تھی۔ مقتول نے بتایا تھا کہ ا
نے مجھے بنگلے میں بلانے کے لیے یہ جھانسہ دیا ہے کہ وہ اقبال

لے گا۔ اِس پر سب کی ڈیوٹیاں مقرر ہوئی تھیں۔ یہ لوگ بنگلے میں
جھے اغوا کرنے گئے تو اندر میجر مرا پڑا تھا۔ محمد خان پر ان سب کا مکمل
عتماد تھا۔

اس ہندو سے بھی اس کے سوا کچھ پتہ نہ چلا کہ انہیں میجر کو قتل
نے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ پوری دیانتداری سے سکیم میں
امل تھا۔

اس سے فارغ ہو کر میں نے تیسرے ملزم (اینگلو انڈین) کے پاس
انے کے لیے کہا تو مجھے کہا گیا کہ تمام ملزموں سے میجر کے قتل کے متعلق
چھا جا رہا ہے یعنی "ٹارچر پریڈ" میں یہ سوال بھی شامل تھا کہ میجر کو
ں نے قتل کیا ہے۔ میں نے اینگلو انڈین سے ملنا ضروری نہ سمجھا البتہ ہندو
لی سے ملنا بہت ضروری تھا۔ اس سے میں مقتول کے گھریلو حالات معلوم
چاہتا تھا۔ میں اب اس یقین تک پہنچ چکا تھا کہ مقتول کو جاسوسوں کے
ہ نے قتل نہیں کیا۔ اب میں توجہ مقتول کی بیوی اور اُس کے منہ بولے
ئی ارشد پر مرکوز کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے توقع تھی کہ ہندو لڑکی
کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے گی۔

میں نے انٹیلی جنس کے میجر سے کہا کہ وہ مجھے لڑکی کے کمرے میں جانے
ے۔ اُسے وجہ بھی بتائی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا — "کیا تم اسے اسی
ت میں دیکھنا پسند کرو گے جس حالت میں وہ ہے؟"
میں اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اُسے بھی

گالوں پر اور سینے پر دانتوں کے نشان تھے۔ بعض میں سے خون نکل آیا تھا وہ رونے لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ یہ لوگ جو کچھ پوچھتے ہیں، وہ سچ سچ بتا دو ورنہ وہ تمہیں اسی طرح شرمناک اذیتیں دے دے کر مار ڈالیں گے۔

"مجھے جو کچھ معلوم تھا بتا چکی ہوں" — اُس نے کہا — "میں نے جن افسروں سے راز کی باتیں معلوم کیں وہ سب بتا دی ہیں اور یہ بھی بتایا ہے کہ میں یہ باتیں کرنل جانسن کو بتا دیا کرتی تھی۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ وہ یہ باتیں جرمن انٹیلی جنس تک کس طرح پہنچاتا تھا۔ مجھے جو اُجرت ملتی تھی وہ بھی بتا دی ہے لیکن یہ لوگ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ گروہ کے ہر ایک آدمی کا اتا پتا بتاؤ اور یہ بھی بتاؤ کہ مسلمان میجر کو کس نے قتل کیا ہے؟"

لڑکی نے بتایا — "ملٹری پولیس مجھے گرفتار کر کے یہاں لے آئی تھی۔ ساری رات جگائے رکھا اور تنگ کرتے رہے۔ میں نے اگلے روز اقبالِ جرم کر لیا۔ پھر یہ دوسری باتیں پوچھنے لگے جو مجھے معلوم نہیں تھیں۔ انہوں نے اُسی روز میرے کپڑے اتار دیئے اور چوبیس گھنٹوں میں چھ سات بار میرے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے۔ رات کو سونے نہیں دیتے۔ کھانے کو اتنا ہی دیتے ہیں کہ میں مر نہ جاؤں"

یہ لڑکی مجرم تھی۔ گناہگار تھی۔ اُس نے مسلمان میجر کا گھر اُجاڑ دیا تھا۔ میجر اسی کی دوستی کی وجہ سے قتل ہوا تھا۔ اس لڑکی نے معلوم نہیں کتنے خاوندوں کے دلوں سے اُن کی بیویوں کی محبت نکال دی تھی۔ وہ جاسوسی جیسے سنگین جرم کی مجرم تھی۔ وہ ہندو تھی۔ اس کے جرائم، گناہوں اور مذہب

کے باوجود اُسے اس حالت میں دیکھ کر میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے بھی عورتوں کو گرفتار کیا تھا۔ انہوں نے مجھے پریشان بھی کیا تھا۔ ان میں سے بعض نے مجرم ہوتے ہوئے جرم سے پردہ اُٹھانے سے انکار کیا تھا مگر میں نے زبانی دھمکی کے سوا کبھی کسی عورت پر ہاتھ نہیں اُٹھایا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تھرڈ ڈگری کا طریقہ کسی عورت پر استعمال کروں گا۔ مجھے کرنل جانسن کی باتیں یاد آئیں۔ اُس نے کہا تھا — "تم نہیں جانتے قومی وقار کیا ہوتا ہے۔ تم انگریزوں کے غلام ہو۔ جُھک کر سلام کرنے کے عادی ہو"

میں اُٹھ کھڑا ہُوا اور بے چینی کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ میں بھول چکا تھا کہ میں انگریز کی پولیس کا تھانیدار ہوں۔ مجھے اس عمارت کے متعلق یہ روایت یاد آنے لگی کہ یہاں ۱۸۵۷ء میں مسلمان لیڈروں اور اُن کے بال بچوں کو قید کر کے بھوکا پیاسا مارا گیا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس روایت میں صداقت تھی یا نہیں لیکن اس میں ضرور صداقت تھی کہ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی مگر ہار گئے تھے اور انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس سے آسمان بھی کانپ گیا تھا۔

انگریزوں نے پردہ نشین مستورات کو سرِعام ذلیل و خوار کیا اور مسلمان بچوں کو تڑپا تڑپا کر مارا تھا۔ گاؤں کے گاؤں صاف کر دیئے تھے۔ میں نے اُس دور کے متعلق جو کچھ پڑھا تھا وہ میری آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ اس ملک کو غلامی کی زنجیروں میں باندھنے کے لیے انگریزوں نے ایسی ایسی

درندگی کی تھی جسے یاد کرکے انگریز کی اولاد کے بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہوں گے۔

اب ایک اور لڑکی ان کے جال میں آگئی تھی۔ وہ بے شک ہندو تھی مگر میرے لیے وہ عورت تھی، غلام تھی۔ وہ بدکار ہی سہی لیکن انگریز افسر اس کے ساتھ کون سی نیکی کر رہے تھے؟ تفتیش کی زحمت سے بچنے کے لیے اُسے وحشی قسم کے گوروں سے خراب کرا رہے تھے اور انگریز میجر خوش ہو رہا تھا۔ وہ مذاق کے موڈ میں تھا۔ میرے جی میں آئی کہ اس میجر سے جا کر کہوں کہ یہ لڑکی میرے حوالے کردو اور مجھے ملٹری انٹیلی جنس کے دو سراغرساں دے دو، میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ ٹارچر کے بغیر لڑکی سے سارے گروہ کی نشاندہی کرادوں گا مگر میں نے ایسے چیلنج کی جرأت نہ کی، کیونکہ یہ کیس مجھے نہیں مل سکتا تھا اور نہ میری کوئی حیثیت تھی۔

مجھے اس لڑکی کے باپ پر غصہ آیا جس نے دولت کے نشے میں یا دولت کمانے کے لالچ میں لڑکی کو انگریز افسروں سے متعارف کرایا اور اسے ایڈوانس اور سوشل بنا دیا تھا۔ اس بدبخت باپ نے لڑکی کو ٹھیکے حاصل کرنے اور بل پاس کرانے کا ذریعہ بنایا تھا۔ لڑکی کو ان غاروں میں وحشی گوروں کے آگے پھینکنے کا ذمہ دار باپ تھا۔

"آپ میرے ہندوستانی بھائی ہیں"۔۔۔ لڑکی نے سسک سسک کر کہا ۔۔۔ "میری مدد کریں۔ انہیں کہیں کہ مجھے اور کچھ پتہ نہیں۔ مجھ پر مقدمہ چلائیں اور مجھے گولی مار دیں یا پھانسی دے دیں۔"

"نجات کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ وہ جو پوچھتے ہیں انہیں بتا دو"۔ میں نے کہا۔۔۔ "جاسوسی کی تفتیش کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں، پھر بھی تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے میجر کے قتل کے متعلق کچھ بتا دو۔"

"میں کچھ نہیں جانتی"۔۔۔ اُس نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "اپنے خدا کے نام پر مان جاؤ کہ میں نے اُسے قتل نہیں کرایا۔ وہ تو میرے گروہ کا ممبر تھا۔"

"اچھا۔ میں مان لیتا ہوں"۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں جو کچھ پوچھوں وہ سچ سچ بتا دو۔ مقتول کے ساتھ تمہارے تعلقات کیسے تھے؟"

"ایک تو وہ میرے گروہ کا ممبر تھا"۔۔۔ لڑکی نے جواب دیا۔۔۔ "وہ ٹھیکیداروں سے رشوت بہت لیتا تھا اور مجھے خوب عیش کراتا تھا۔ میں اس کی ہر بات مانتی تھی، بلکہ اس کی داشتہ بنی ہوئی تھی۔"

"اُس نے کبھی تمہیں شادی کے لیے کہا تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے کبھی اس کے ساتھ شادی کی خواہش ظاہر کی تھی؟"

"شادی کی کیا ضرورت تھی؟"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "مجھے کرنل جانسن نے شادی کے لیے کہا تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں ساری عمر آزاد رہنا چاہتی ہوں۔ میرے لیے مردوں اور دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میجر (مقتول) نے شادی کا کبھی اشارہ بھی نہیں کیا تھا"۔۔۔ یہ کہہ کر اُس نے بھکاریوں کی طرح کہا۔۔۔ "مجھے پانی پلا دیں۔ یہ لوگ مجھے پانی بھی ترسا ترسا کر دیتے ہیں۔"

میں میجر کے پاس چلا گیا۔ اُس کے کمرے میں تین افسر بیٹھے چائے

پی رہے تھے۔ میں نے میجر سے کہا کہ ایک گلاس پانی اور چائے کی ا پیالی چاہیئے۔

میجر نے مسکرا کر کہا۔ "آپ ہمارے ملزموں کو خراب کر رہے ہیں"

میں نے اُسے کہا۔ "میرا طریقۂ تفتیش مختلف ہے۔ یہ لڑکی میرے متعلق کچھ کام کی باتیں بتا رہی ہے۔"

میجر نے مجھے چائے کی ایک پیالی بنا دی اور پانی کا گلاس بھی دیا۔ میں پیالی اور گلاس اٹھائے لڑکی کے پاس گیا۔ اُس نے لپک کر گ مجھ سے چھین لیا مگر جب ہونٹوں سے لگایا تو میں نے گلاس پکڑ لیا ا اُسے کہا۔ "آہستہ آہستہ پیو۔"

وہ پانی پی چکی تو میں نے چائے کی پیالی اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ اس کا ہاتھ چائے کی پیالی کا بو بھی اٹھا نہ سکا۔ میں نے اُس کے ہاتھ سے پرچ پیالی لے لی اور ا ہاتھ سے اُسے چائے پلانے لگا۔ اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں آج رات مر جاؤں گی۔ میرے جسم میں کچھ نہیں رہا۔"

چائے نے اُس کے جسم میں ذرا سی جان ڈال دی۔ میں نے ا سے پوچھا۔ "مقتول تمہارے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا؟"

"بالکل نہیں" — اس نے جواب دیا۔ "اگر وہ کہتا بھی تو میں نہ مانتی۔"

"اپنی بیوی کے ساتھ اُس کے تعلقات کیسے تھے؟"

مقتول کی بیوی —

ایک اور بھید

اس سوال کے جواب میں اور اس کے بعد میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں اُس سے مجھے جو معلومات ملیں وہ تفصیلاً یہ تھیں کہ مقتول نے اپنی بیوی کو سوشل بنانے کی کوشش کی تھی جو بیوی نے کامیاب نہ ہونے دی۔ ہندو لڑکی کی رائے کے مطابق مقتول کی بیوی بے حیائی پسند نہیں کرتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اُسے اس ہندو لڑکی کا اپنے خاوند کے ساتھ اتنا گہرا میل جول پسند نہ تھا۔ مقتول کو اپنی بیوی سے دلی محبّت تھی۔

اُس کی بیوی نے جب ہندو لڑکی پر مقتول کے ساتھ احتجاج اور جھگڑا شروع کر دیا تو مقتول بہت پریشان ہوا۔ اُس نے اس ہندو حسینہ سے دو تین بار کہا کہ وہ اس کی دوستی سے دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی بیوی کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا مگر وہ جاسوسی کے جس جال کا حصہ بن چکا تھا اس سے اُس کا زندہ نکل آنا ممکن نہیں تھا۔ لڑکی نے بتایا کہ جاسوسی ایسا کام ہے کہ اس سے اگر کوئی ممبر الگ ہو جائے تو اُسے قتل کر دیا جاتا ہے کیونکہ نہایت اہم راز اور گروہ کی دکھتی رگیں اُس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ وہ کسی بھی وقت دھوکہ دے سکتا ہے۔ ایک بار اُس نے کرنل جانسن سے کہا کہ وہ وعدہ کرتا ہے کہ کوئی راز فاش نہیں کرے گا،

اُسے الگ کر دیا جائے لیکن کرنل جانسن نے اُسے نہایت اچھے انداز میں قائل کر لیا کہ وہ الگ نہ ہو۔ الگ نہ ہونے کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ اِس لڑکی سے بھی الگ نہیں ہو سکتا تھا۔ لڑکی میں اتنی کشش تھی جب لڑکی اور شراب اکٹھی ہو جاتی تھیں تو مقتول بے قابو ہو جاتا تھا۔

لڑکی نے مقتول کی بیوی کے ساتھ دوستانہ گانٹھنے اور اُسے سوشل بنانے کی کوشش کی تھی مگر بیوی نے اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیا تھا۔ "میں ہندو کی بچی نہیں۔ مسلمان باپ کی بیٹی ہوں۔ تمہارا مذہب سچا ہے تو تم میں غیرت اور حیا بھی ہوتی۔"

اس کے بعد یہ لڑکی میجر (مقتول) سے ملتی رہی۔ اُس کی بیوی کے سامنے نہیں گئی۔ ایک روز مقتول نے اس لڑکی کو بتایا کہ رات اُس کی بیوی نے اُسے، کرنل جانسن اور لڑکی کو شرمناک حالت میں دیکھ لیا ہے۔ وہ بہت پریشان تھا۔ اس سے کچھ ہی روز بعد مقتول نے ہندو لڑکی کو بتایا کہ اُس کے گھر میں برادری کا ایک آدمی آنے لگا ہے جو اچھے چال چلن کا آدمی نہیں۔ مقتول کچھ پریشان سا تھا پھر جوں جوں دن گزرتے گئے۔ مقتول اپنی بیوی کے متعلق شک و شبہ کا اظہار کرنے لگا۔ اس ہندو لڑکی نے بھی اس آدمی کو دیکھا تھا وہ ارشد تھا۔ لڑکی نے مجھے بتایا کہ وہ مردوں کی ڈیل ڈول اور انداز سے اُن کی نیت اور اخلاق کا پتہ چلا لیتی ہے۔ ارشد کو اُس نے صرف ایک بار دیکھا تھا اور اُس نے ارشد کے متعلق میجر سے کہا تھا کہ یہ

آدمی شریف ہو ہی نہیں سکتا۔

مقتول نے لڑکی کو ایک روز یہ بتایا کہ اُس نے اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا ہے۔ ارشد کے متعلق جھگڑا ہوا تھا۔ بیوی نے اُسے کہا تھا کہ تم اس ہندو لڑکی سے تعلق توڑ لو اور میں ارشد سے تعلق توڑ لوں گی۔ مقتول کی بیوی ڈیڑھ دو مہینے سے میکے میں تھی۔ اس دوران ارشد دو دفعہ مقتول کے پاس آیا اور اُسے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ یہ بات میجر (مقتول) نے ہندو لڑکی کو بتائی تھی۔ اس سے مقتول کا شک پختہ ہو گیا کہ ارشد اُس کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔

میرے لیے لڑکی کا یہ بیان ایک نیا انکشاف تھا۔ میں نے مقتول کے باپ کو تفتیش کے دوران بتایا تھا کہ اُس کی بیوی اور ارشد کے تعلقات قابل اعتراض نہیں، وہ تمہارے ساتھ ناٹک کھیل رہے ہیں۔ میری اس بات پر مقتول سوچ میں پڑ گیا تھا بلکہ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اُسے اطمینان ہوا تھا کہ اُس کی بیوی نے اُس کے ساتھ بے وفائی نہیں کی۔ مقتول نے اُس وقت مجھے کوئی ایسی بات نہیں بتائی تھی کہ ارشد نے اُسے کہا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔

"مقتول نے ارشد کے متعلق یہ بات تمہیں کب بتائی تھی؟" ——— میں نے اُس سے پوچھا۔

"جس روز آپ نے دوسری بار اُس سے تفتیش کی تھی۔ اس سے

اگلے روز یا شاید دو روز بعد" لڑکی نے جواب دیا۔" میں اپنے مشن سے واپس آئی تو گھر جانے سے پہلے کرنل جانسن کے پھر اس میجر کے بنگلے میں گئی تھی۔ اپنے کام کی باتیں کہہ سن کر میجر نے بتایا کہ آج ارشد آیا تھا۔ کہتا تھا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے دو نے اُس کے ساتھ ترش کلامی کی تو ارشد نے دھمکی کے لہجے تھا کہ یہ بیوی تمہارے گھر میں نہیں آسکے گی۔ اگر آئے گی تو تم میں نہیں ہو گے۔ میجر بہت پریشان تھا۔ اس نے یہ بھی کہا تھ کام (جاسوسی) نے اس سے اتنی پیاری بیوی چھین لی ہے"۔

یہ اس ہندو لڑکی اور مقتول کی آخری ملاقات تھی۔ اس بعد لڑکی کے باپ نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ لڑکی واپس آ میں نے لڑکی کو تھانے بلا کر باپ کی شخصی ضمانت پر اسے پابن تھا۔ میں حیران ہوا کہ میرا کوئی مخبر اس لڑکی کو میجر کے بنگلے میں جا نکلتے نہیں دیکھ سکا تھا۔

میں نے لڑکی سے چند اور ضروری باتیں پوچھیں اور جب ا لگا تو اُس نے میرے پاؤں پکڑ لیے۔ اس سے تو اب رہا بھی نہ جاتا تھا۔ سسک سسک کر منتیں کرنے لگی کہ ان لوگوں سے نج دلاؤ۔ وہ ظالموں کے شکنجے میں آئی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے چھوڑ دی کہ اُسے اس اذیت سے چھڑانے کی کوشش کروں گا۔ کمرے ایسی بیہودہ بدبو تھی کہ مجھے متلی آرہی تھی۔ کمرہ بڑا ہی سرد تھا

ں یہ لڑکی ننگی بیٹھی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میرے یہاں سے نکلتے ہی گورے اس سے کمبل چھین لیں گے جو انہوں نے میری خاطر دیا ا۔ یہ شہزادی تھی۔ بڑے بڑے انگریز افسروں پر اُس نے حسن و ائی کا جادو چلایا تھا۔ اس نے صحیح معنوں میں دلوں پر بادشاہی تھی اور انگریز افسروں کے سینوں سے راز نکال کر جرمنی پہنچائے تے۔ میں نے اس شہزادی کو ایسی ذلت میں دیکھا تو خدا یاد آگیا۔

قاتل کے کپڑے ___ مقتول کا خون

میں اُسے اس حالت میں چھوڑ آیا جس سے اُس کا زندہ بچ نکلنا لن نہیں تھا اور وہ شاید زندہ رہی بھی نہیں۔ انٹیلی جنس کے میجر شکریہ ادا کر کے میں وہاں سے اس طرح بھاگا جیسے یہ لوگ میرے کپڑے اتار کر مجھے بھی کسی غار جیسے یخ کمرے میں بند کر دیں گے۔ راخیال ہے کہ میرے سوا اس بارود خانے کے اندر کا راز کسی اور معلوم نہیں ہو سکا۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ یہ ملزم اس راز کو اپنی نام قبروں میں لے گئے ہوں گے۔

وہاں سے میں نکلا تو دل پر بہت بوجھ تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ں اگلے جہان دوزخیوں کو دیکھ کر آیا ہوں۔ تھانے میں گیا تو بہت رتک اپنے کیس کے متعلق کچھ سوچ نہ سکا۔ یہ ہندو لڑکی آنکھوں

کے سامنے سے ہلتی ہی نہیں تھی۔ انگریز افسروں نے اسے د
اور وحشیوں جیسے گوروں کے آگے پھینک دیا تھا۔ بے شک
مجرم تھی لیکن شہادت اور ثبوت حاصل کرنے کے اور طریقے
ہیں۔ مجھے کچھ ایسے غصہ آ رہا تھا جیسے انگریز سارے ہندوستا
آبرو ریزی کر رہے ہوں۔

رات کے وقت میرا ذہن آہستہ آہستہ قتل کی تحقیقات کی
آ گیا ہندو لڑکی کے بیان کے مطابق ارشد نے مقتول کو دھم
تھی کہ وہ بیوی کو طلاق دے دے اور کہا تھا کہ اس کی بیو
اس کے گھر نہیں آئے گی۔ اگر وہ آئی تو مقتول اس گھر میں نہ
رہے گا۔ مجھے تو ارشد نے کہا تھا کہ وہ اس بھولی بھالی لڑکی
کی بیوی) کی خاطر مقتول کو راہِ راست پر لانا چاہتا ہے۔ پھر طلا
کیوں زور دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی مجھے ارشد کے چند الفاظ یاد آئے جو ا
نے میرے ساتھ باتیں کرتے ہوئے کہے تھے۔ اس نے کہا تھا "
لڑکی (مقتول کی بیوی) کے بیے میں اس قسم کے ایک درجن میجر
کر سکتا ہوں"۔ پھر اس نے مقتول کی بیوی کی بے حد تعریف کی تھی
"ادھر ہماری بیوی ہے جیسے کھرلی پر گائے بندھی ہوئی ہو
اس کے ساتھ ہی مجھے اس کی بیوی کی یہ بات یاد آئی کہ ارشد نے
کہا تھا کہ مجھ سے طلاق لے لو۔

میں نے اُس وقت بھی ارشد کے متعلق یہ رائے قائم کی تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر دلیر اور خوش باش آدمی ہے۔ مقتول کے مقابلے میں وہ خوبرو بھی تھا اور اس میں ایسی کشش تھی کہ عورت ذات اُسے پسند کرے۔ مقتول کی بیوی بھی خوبصورت اور پُرکشش قد کاٹھ کی تھی۔ وہ سیدھی سادی عورت نہیں تھی۔ اس کے بولنے کے انداز سے میں نے سوچا تھا کہ اس میں خود اعتمادی اور جرأت موجود ہے۔ اب ہندو لڑکی نے جو انکشاف کیا تھا اس سے مجھے شک ہو گیا تھا کہ میجر کو اس کی بیوی اور ارشد نے ہی قتل کرایا ہے مگر یہ شک یقین میں بدل جاتا تو بھی میں اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیونکہ کوئی ثبوت نہیں تھا، کوئی شہادت نہیں تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ ارشد پر ثابت کر دیتا کہ تم قاتل ہو لیکن عدالت میں اسے قاتل ثابت کرنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے ارشد سے (اگر واقعی قاتل تھا) اقبالِ جرم کرانا تھا اور شہادت اسی سے حاصل کرنی تھی۔ مجھے پتھر سے دودھ نکالنا تھا۔

میرے دماغ میں پہلا سوال یہ آیا کہ میں مقتول کی بیوی سے ملوں؟ — بیکار تھا۔ اس کے خلاف تو کوئی ثبوت نہ تھا۔ عقل نے کہا ارشد پر حملہ کر، مگر ذرا بچ کر۔

میں نے اُسی وقت ایک کانسٹیبل بھیج کر اپنے دو نہایت ہوشیار اور عقلمند مخبر بلائے۔ انہیں دوسرے دن بارہ بجے سے پہلے دو خبریں

لانے کو کہا اور انہیں معمول کی اُجرت کے علاوہ انعام کا لالچ بھی دیا۔ ان میں ایک جیب تراش تھا۔ دو دفعہ کا سزا یافتہ تھا۔ تیسرا مقدمہ ابھی ابھی عدالت میں گیا تھا۔ وہ ضمانت پر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ یہ معلومات لے آئے تو میں اُس کا یہ مقدمہ عدم ثبوت کی بنا پر بری کرا دوں گا۔

دوسرے دن سورج نکلتے ہی میں ارشد کے سسرال چلا گیا اور اُس کے سسر سے ملا۔ مجھے اُس کی بیٹی بہت بڑے خطرے میں نظر آ رہی تھی۔ گو مجھے ابھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا کہ قاتل ارشد ہی ہے لیکن پولیس والوں کی ایک جو فالتو رگ ہوتی ہے، وہ پھڑکنے لگی تھی۔ مجھے کچھ ایسا نظر آنے لگا تھا کہ میجر قتل ہوا ہے تو قاتل اب اپنی بیوی کو قتل کرے گا تا کہ مقتول کی بیوی کے ساتھ شادی کر سکے۔ برادری میں بلاوجہ طلاق نہیں دی جا سکتی تھی۔

ایسے کئی کیس میرے ہاتھوں سے گزر چکے تھے۔ میں اس سیدھی سادی عورت کو بچانے کی ترکیب کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ باتیں پوچھنی بھی تھیں تا کہ ارشد کے سامنے جاؤں تو اُسے کامیابی سے گھیر سکوں۔ اُس کے سسر سے میں ملا تو معلوم ہوا کہ ارشد تین روز گزرے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ بزرگوں نے ان کا سمجھوتہ کرا دیا تھا۔ میں اب یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ارشد اپنی بیوی کو بادلِ نخواستہ لے گیا تھا یا ہنسی

خوشی لے گیا تھا یا اُس کا رویّہ کیسا تھا۔ میرے دماغ میں ایک نئی سوچ آئی تھی۔ اس کی تصدیق یا تردید کے لیے مجھے یہ معلومات حاصل کرنی تھیں۔ ارشد کا سسر میری بات سمجھ نہ سکا۔ بڑی مشکل سے میں نے اس سے مطلوبہ رائے حاصل کی۔ اس نے بتایا کہ وہی ارشد جو اپنی بیوی کو پلّے ہی نہیں باندھتا تھا اور اس سے جان چھڑانا پھرتا تھا، اب اپنی بیوی کو اس طرح ضد کر کے لے گیا کہ بیوی کے والدین کسی وجہ سے دو روز بعد بھیجنا چاہتے تھے لیکن ارشد کہہ رہا تھا کہ ابھی لے جاؤں گا۔

”یہ اُس کا مطالبہ تھا؟“ — میں نے پوچھا — ”یا ضد تھی؟“

”نہیں جی!“ — سسر نے جواب دیا — ”اندر اپنی بیوی کے پاس چلا گیا اور اسے کہنے لگا کہ ابھی میرے ساتھ چلو۔ میں تم سے گھر جا کر معافی مانگوں گا۔ آئندہ تمہیں شکایت نہیں ہو گی۔“

”آپ اُس کے اس رویّے سے خوش ہوئے ہوں گے؟“

”ہاں جی!“ — اُس نے کہا — ”اُس نے میری بیٹی کو قبول کر لیا تھا۔“

”کیا آپ حیران نہیں ہوئے تھے کہ اس کا رویّہ اچانک کس طرح بدل گیا ہے؟“

”میں نے اپنی بیوی سے حیرت کا اظہار کیا تھا“ — اُس نے جواب دیا — ”میری بیوی نے کہا تھا کہ دیوان صاحب کا تعویذ کام کر گیا ہے۔“

اُس نے دیوان صاحب (ایک مشہور مزار) کا تعویذ ارشد کو اس کی بیوی کے ہاتھوں پانی میں گھول کر پلایا تھا"۔

"آپ نے ارشد کے گھر جا کر دیکھا ہے کہ آپ کی بیٹی ارشد کے ساتھ اب مطمئن ہے؟"

"اسے گئے ابھی تین ہی روز تو ہوئے ہیں" — اُس نے جواب دیا۔ "اتنی جلدی ہمارا جانا اچھا نہیں لگتا۔ ارشد کہے گا کہ یہ لوگ جاسوسی کرنے آئے ہیں"۔

"آپ جا کر دیکھیں" — میں نے اسے کہا۔

"کیوں؟" — اُس نے پوچھا — "کوئی گڑبڑ ہے؟"

"مجھے ڈر ہے کہ ارشد کا پیر آپ کے دیوان صاحب سے زیادہ کامل ہے" — میں نے اُسے کہا — "آپ یا آپ کے گھر کا کوئی فرد ارشد کے گھر جائے اور اگر آپ کی بیٹی میں کوئی گڑبڑ نظر آئے تو مجھے نہایت رازداری سے آج ہی تھانے آکر بتایا جائے"۔

ارشد کا سسر گھبرا گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرا مقصد کیا ہے۔ میرے تجربات نے مجھے ایک شک میں ڈال دیا تھا۔ یہ شک غلط بھی ہو سکتا تھا لیکن سراغرسانی کی عمارت شکوک کی بنیادوں پر ہی کھڑی کی جاتی ہے۔ میں نے ارشد کے سسر کو یہ بھی سختی سے کہا کہ وہ ارشد کو نہ بتائے کہ میں اس کے گھر آیا تھا۔ اسے فوراً ارشد کے گھر جانے کو کہہ کر میں تھانے چلا گیا۔ مجھے اُن دو مخبروں سے رپورٹ

ملنی تھی جنہیں میں نے رات کو بلایا تھا۔

جیب کترا مخبر بارہ بجے کے قریب آ گیا۔ اُس نے نہایت کام کی خبر دی۔ میں نے اسے کہا تھا کہ یہ معلوم کرے کہ ارشد کے کپڑے کون سے دھوبی کے پاس جاتے ہیں۔ وہ امیر آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اُس کے کپڑے گھر میں نہیں دھلتے ہوں گے۔ اگر اس نے قتل خود کیا ہے تو اس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ضرور پڑے ہوں گے۔ اُس نے کپڑے دھوبی کو دیئے ہوں گے مگر یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جبکہ قتل اُس نے خود کیا ہو۔ وہ روپے پیسے والا آدمی تھا۔ عین ممکن تھا کہ اُس نے اپنے کسی مزارعے یا قابلِ اعتماد نوکر سے بھیج کر قتل کرایا ہو۔ اس صورت میں میرے لیے سراغرسانی ناممکن تھی۔ بہرحال یہ بھی ایک امکان تھا جس کا سہارا لے کر میں آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

دوسرا مخبر اس جیب کترے سے کوئی ایک گھنٹہ بعد آیا۔ وہ بھی مطلب کی خبریں لے آیا۔ اُس نے آ کر بتایا کہ ارشد کا اپنا پرائیویٹ تانگہ ہے۔ کوچوان اس کا ملازم ہے۔ مخبر نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ اس تانگے کے دائیں پہیے کے ربڑ میں تھوڑا سا خلا ہے۔ میں نے اُسے یہی ہدایات دے کر بھیجا تھا۔ یہ معلومات میں خود بھی جا کر حاصل کر سکتا تھا لیکن ارشد پر ایک ہی بار جھپٹنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے میں اُسے اپنے متعلق شک میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسی وقت دھوبی لانے کے لیے کانسٹیبل کو بھیج دیا۔

وہ ایک گھنٹے بعد آیا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ خوفزدہ تھا۔ میں
اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تو اس کی رہی سہی جان
نکل گئی — میں نے اسے کہا — "میں نے تمہیں سچ بولنے کے
بلایا ہے۔ اگر جھوٹ بولو گے تو یہاں سے واپس نہیں جا سکو گے
اُس نے ہاتھ جوڑ کر وعدہ کیا کہ وہ سچ بولے گا۔

"ارشد کے کپڑے تم دھوتے ہو؟"

اُس کے چہرے پر جو تبدیلی آئی اس سے میں جان گیا کہ و
بات سمجھ گیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے کہا — "ہاں حضور! ا
کپڑے میں ہی دھوتا ہوں۔"

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور منہ اُس کے منہ کے
لے جا کر رازداری سے پوچھا — "وہ کپڑے اُسے واپس دے د
ہیں؟" وہ چپ رہا۔ میں نے کہا — "سوچ کر جواب دو۔ اگر جھوٹ
بولنا چاہتے ہو تو بے شک جھوٹ بولو۔ میں تمہیں ایک قاتل ک
کرنے کے الزام میں دس سال کے لیے جیل بھجوا دوں گا۔"

ایک غریب سے دھوبی کے لیے اتنی سی دھمکی کافی تھی۔ اُس
تھوڑی سی پس و پیش کی۔ کچھ ایسی حرکتیں بھی کیں جیسے وہ میری
سمجھ نہیں رہا لیکن میں نے جب اُسے کہا کہ پچھلے بدھ کی رات ا
نے تمہیں خون سے لتھڑے ہوئے جو کپڑے دیئے تھے وہ اُسے وا
کر دیئے ہیں؟ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "حضور والا! میں نے

یہ سمجھ کر وہ کپڑے لے لیے تھے کہ شاید وہ خود زخمی ہو گئے ہیں اور یہ
اُن کا اپنا خون ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں نے ایک قاتل کی مدد کی ہے۔"

اس کے بعد اُس نے میرے صرف پاؤں نہیں چھوئے، باقی
اُس نے منت سماجت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں نے اُسے
تسلی دے کر پوچھا کہ کیا وہ کپڑے واپس کر دیئے ہیں؟

"پرسوں واپس کیے تھے" — اُس نے جواب دیا — "لیکن شلوار
سے داغ پوری طرح صاف نہیں ہوئے۔ انہوں نے کل پھر واپس کر
دیئے ہیں۔ میرے پاس ہی پڑے ہیں" — میرے پوچھنے پر اُس نے
بتایا کہ کپڑے اُسے کب دیئے گئے تھے۔ اُس کے جواب کے مطابق
قتل کی اگلی شام اسے دیئے گئے تھے اور کپڑے ارشد کا کوچوان لایا
تھا۔ دھوبی کے کہنے کے مطابق داغ پکے ہو چکے تھے۔ ان کپڑوں
میں شلوار، بوسکی کی قمیص اور واسکٹ تھی۔

میں نے اُسے گرفتار کر لیا

یہ بالکل واضح ہو گیا کہ قاتل ارشد ہے۔ ظاہر تھا کہ مقتول
کی بیوی بھی قتل میں شریک تھی۔ میں نے دھوبی کو، ہیڈ کانسٹیبل اور
دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور دھوبی کی دکان پر چلا گیا۔ دو آدمی
بحیثیت مشیر ساتھ لیے اور اُن کے سامنے دھوبی سے ارشد کے

کپڑے برآمد کرائے۔ تینوں کپڑوں پر خون کے مدہم مدہم چھینٹے تھے۔ دھوبی نے ابھی انہیں دوبارہ بھٹی نہیں چڑھایا تھا۔ وہ بے چارہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس نے مشیروں کے سامنے جو بیان ر کرایا اس میں اُس نے یہ بھی لکھوایا کہ ارشد کے کوچوان نے اُسے ارشد کا یہ پیغام دیا تھا کہ ان کپڑوں کو درپردہ صاف کرے اور اس کے اُسے بیس روپے ملیں گے۔ میں نے کپڑوں کی برآمدگی کا مشیر نامہ تیار کر کے اس پر دھوبی کا انگوٹھا لگوایا اور دونوں مشیروں کے دستخط لیے۔

وہیں سے میں ارشد کے گھر چلا گیا۔ یہ کوٹھی نما مکان تھا بہت کھلا سا لان تھا۔ ایک تانگہ کھڑا تھا۔ بڑا خوبصورت پرائیویٹ تانگہ تھا۔ کوچوان گھوڑے کو تھپکیاں دے رہا تھا۔ میں اپنے سٹاف کے ساتھ ابھی کچھ دور تھا۔ اندر سے ارشد نکلا اور تانگے میں بیٹھا۔ کوچوان اگلی سیٹ پر بیٹھا اور اُس نے تانگہ موڑا۔

میں رک گیا۔ تانگہ ہماری طرف آیا تو میں آگے ہو گیا۔ ارشد نے قریب آ کر تانگہ رکوایا اور کود کر اترا۔ میری طرف آتے ہوئے اپنے مخصوص شگفتہ اور لاپرواہ سے لہجے میں بولا — "ہاں ملک صاحب! آپ کدھر گھوم پھر رہے ہیں؟ دیکھا آپ نے؟ خدا نے اُسے کیسی سزا دی ہے؟ مجھے بہت افسوس ہے کہ وہ مارا گیا ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ یہ اس کی بیوی کی آہ کا اثر ہے۔"

میں نے اس کے سوا کچھ بھی نہ کہا — "تانگے میں بیٹھو۔ ہم بھی آپ کے ساتھ چلیں گے۔ تھانے جا رہا ہوں۔"

"تو آئیے نا ملک صاحب!" — اس نے پرجوش انداز سے کہا — "میں آپ کو لے چلتا ہوں۔"

وہ تانگے کی طرف چلا تو میں نے زمین پر دیکھا۔ کچی جگہ تھی۔ اس پر اس کے جوتے (شوز) کا وہی نشان تھا جو بنگلے اور فصیل کے درمیان اور باہر دیکھا گیا تھا۔ دائیں پاؤں کی ایڑی ایک طرف سے مرمت شدہ تھی۔ تھانے میں اس کا مولڈ موجود تھا۔ میں اُس کے ساتھ تانگے کی پچھلی سیٹ پر، ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

ارشد نے کوچوان سے کہا — "چھاؤنی کے تھانے چلو۔" تانگہ چلا تو میں نے کچی زمین پر پہیوں کے نشان دیکھے۔ دائیں پہیے کے نشان میں تھوڑا سا خلا پہیے کے چکر کے بعد صاف دکھائی دے رہا تھا۔ راستے میں ارشد مقتول کے خلاف باتیں کرتا رہا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ قاتل گرفتار ہوا یا نہیں۔ میں نے اُسے جواب دیا — "آج کچھ سراغ ملا ہے۔ شاید شام تک پکڑا جائے گا۔"

"کون ہے وہ؟" — اس نے پوچھا۔

"ابھی نہیں بتا سکتا" — میں نے جواب دیا — "گرفتاری کے بعد بتاؤں گا۔"

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور تھانہ آ گیا۔ کوچوان تانگہ

تھانے کے اندر لے گیا۔ میں نے ارشد سے کہا۔ "آیئے، تھوڑی
دیر گپ شپ ہو جائے گی۔"

اُس نے جواب دیا۔ "پھر کبھی حاضر ہوں گا۔ بہت ضروری کام
ہے۔" وہ میرے ساتھ تانگے سے اُترا۔ میں نے کوچوان سے کہا کہ
تم بھی پیچھے آ جاؤ۔ ایک کانسٹیبل سے کہا کہ تانگہ پرے لے جاؤ اور
ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ارشد کو حوالات میں بند کر دو اور کوچوان کو
پچھلے کمرے میں لے چلو۔

ارشد کا رنگ اُڑ گیا۔ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ اُس کی زبان
بند ہو گئی۔ ہیڈ کانسٹیبل اسے بازو سے پکڑ کر لے جانے لگا تو اُس نے
ہکلا کر کہا۔ "مم۔ مم۔ مم ملک صاحب! یہ بڑی زیادتی ہے۔"

میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ارشد کے کپڑوں کا بنڈل اے
ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ کے حوالے کر کے کہا کہ اس کا پارسل تیار کراؤ اور
چٹھی بھی تیار کرو۔ اس پارسل کو فورنسیک ٹسٹ کے لیے بڑی دُور
جانا تھا۔ فورنسیک میڈیسن ایک ایسا سائنسی طریقہ ہے کہ جس سے
کپڑوں پر، فرنیچر پر، دری اور قالین وغیرہ پر خون کے جو داغ اتنے دُھل
جائیں کہ انسانی آنکھ سے دیکھے بھی نہ جا سکیں، اس سے نشان نمایاں
ہو جاتے ہیں اور مصدقہ طور پر پتہ چل جاتا ہے کہ یہ داغ خون کے ہیں
یا نہیں۔

میں اُس کمرے میں چلا گیا جہاں کوچوان کو بھیجا تھا۔ یہ تفتیشی

س کمرہ تھا جس میں مجھ سے پہلے ایس ایچ او ملزموں پر بے رحمی
، تشدد کر کے تفتیش کیا کرتے تھے۔ کسی ملزم کو اُس کمرے میں لے
نے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ زبانی سوال جواب نہیں ہوں گے۔
چوان کو اُس کمرے میں گئے آدھا گھنٹہ ہو گیا تھا۔ کانسٹیبلوں کو
ی ڈیوٹی کا علم تھا۔

میں جب اُس کمرے میں گیا تو دو کانسٹیبلوں نے میری ہدایت
، بغیر اور مجھ سے پہلے کے تھانیداروں کے طریقۂ کار کے مطابق
چوان کو تشدد کے پہلے مرحلے میں داخل کر دیا تھا۔ وہ یہ کہ اُسے
یٹھ کے بل لٹا دیا گیا تھا۔ ایک ڈنڈا زمین سے متوازی درمیان
ں سے اُس کے منہ میں ڈال کر اُس کے دونوں سرے رسیوں سے
ں کی کلائیوں سے باندھے ہوئے تھے، یعنی اس کے بازو دائیں
ئیں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک کانسٹیبل اس کے سر کی طرف پنچ پر
ٹھا تھا جس نے دونوں پاؤں ڈنڈے پر رکھے ہوئے تھے۔ پاؤں
دبانے سے ڈنڈا کوچوان کے منہ (ہونٹوں کے کونوں) میں اُتر
جاتا تھا۔ کوچوان تڑپتا تھا اور اُس کے حلق سے خراٹے نکلتے تھے۔

کانسٹیبلوں نے پچھلی عادت کے مطابق یہ عمل شروع کر دیا تھا۔
تشدد کے اس طریقۂ کار کا آدھا گھنٹہ ٹھکانے لانے کے لیے کافی
ہوتا ہے۔ عادی مجرم سارا دن بھی سہہ جاتے ہیں۔ میں نے کانسٹیبلوں
سے یہ نہ کہا کہ انہوں نے میرے کہے بغیر اس پر تشدد کیوں شروع

کر دیا ہے۔ اس کی بجائے میں نے اُس کے منہ سے ڈنڈا ہٹا
— "جو پوچھوں گا سچ سچ بتا دو گے ؟"

اُس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ سسک کر بولا — "آپ پوچھے بغیر مجھے سولی پر چڑھا دیا ہے۔"

میں نے اُسے اسی حالت میں رہنے دیا اور مقتول کا نام پوچھا — "تم فلاں رات مقتول کے بنگلے میں ارشد کو تانگے پر تھے ؟" — اس کے ساتھ کہا — "اگر تم نے جھوٹ بولا تو ڈنڈا میں ڈال دوں گا اور کل اس وقت تمہارے پاس آؤں گا اور یہ بھی بتا دوں کہ ارشد بک پڑا ہے۔ اُس نے جرم قبول کر لیا ہے"

"جناب ! میں تو اس کا نوکر ہوں" — اس نے کہا — "اس نے دیا کہ تانگہ جوتو اور چلو۔ میں اسے میجر صاحب کے بنگلے میں لے گیا نے تانگہ دُور رکوایا اور مجھے ایک جگہ بتا کر کہا وہاں کھڑے رہنا اندر چلا گیا۔ میں تانگہ اُس جگہ لے گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بنگلے باہر والی دیوار پھلانگ کر آیا۔ اُس نے مجھے آواز دی۔ میں نے تا موڑا اور اُسے بٹھا کر گھر لے گیا۔"

میں نے اُس کے ہاتھ کھول دیئے اور بٹھا دیا۔ کانسٹیبل سے ک اسے پانی پلا دے۔ اُسے تسلی دلاسہ دیا۔ وہ بار بار کہتا تھا کہ اُس کا قصور نہیں۔ وہ نوکر ہے۔ اُس نے حکم مانا ہے۔ وہ دراصل غریب مزارعہ تھا۔ میں ان لوگوں کی حیثیت کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ قا

کے مطابق وہ اعانتِ جرم کا مجرم تھا لیکن میں نے اسے بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے میں میری خود غرضی بھی شامل تھی۔ شہادت کے لحاظ سے کیس پیچیدہ تھا۔ مجھے سلطانی گواہ کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے یہی آدمی موزوں تھا۔ مجھے بہت حد تک یقین ہو گیا تھا کہ مقتول کی بیوی بھی اس واردات میں شامل ہے۔ ان تینوں میں موزوں سلطانی گواہ کوچوان ہی تھا۔

میں نے اُسے کہا کہ جو کچھ وہ جانتا ہے وہ بتا دے۔ پھر اُس کا بیان مجسٹریٹ کے سامنے ہو گا۔ پھر اُسے جیل کی حوالات میں بھیج دیا جائے گا اور جب مقدمہ شروع ہو گا تو اُس کی گواہی کے بعد اُسے رہا کر دیا جائے گا۔ وہ جیل کے نام سے سخت گھبرایا۔ میں نے تسلی دلاسے دے کر اُسے بتایا کہ اُسے سزا کے لیے نہیں بلکہ اس کی حفاظت کے لیے جیل میں رکھا جائے گا۔ بہرحال اُسے اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ وعدہ معاف گواہ کیا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا۔

مقتول کی بیوی کی لپ سٹک کے نشان اور چوڑی کے ٹکڑے

اُس نے بیان دے دیا۔ میں نے ارشد کے ساتھ کوئی بات نہ کی۔

اُسے حوالات میں بند رہنے دیا۔ اگلے روز ایک تو اس کا سات
روز کا ریمانڈ لیا اور دوسرے اس کوچوان کا بیان مجسٹریٹ سے
ریکارڈ کرا لیا۔ سلطانی گواہ بنانے کے ضمن میں جو قانونی چارہ جو
کرنی تھی وہ بھی کر لی اور کوچوان کو جیل کی حوالات میں بھجوا
اُس کے بیان نے میرا راستہ صاف کر دیا۔ ارشد کے چال چلن
متعلق کوچوان نے بتایا کہ گھر والوں سے الگ رہتا ہے۔ اپنی مر
کرنے والا یعنی خود سر اور باغی قسم کا آدمی ہے۔ اُس نے باپ
جائیداد کا حصہ الگ کر دیا ہے لیکن کوئی ناراضگی پیدا نہیں ہو
دی۔ ساری برادری اُس سے ڈرتی بھی ہے اور اُس کی عزت
بھی کرتی ہے۔ ہر کسی کے کام آنے والا آدمی ہے۔ برادری میں
کوئی کسی مشکل میں پھنس جائے ارشد بن بلائے پہنچ جاتا اور اُس
کی مدد کرتا ہے۔ مزارعوں کے ساتھ اس کا سلوک بہت ہی اچھا
کسی کی بہو بیٹی کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا۔ البتہ رنڈیوں کا
گانا سننے کا شوقین ہے۔ گھر سے دور بدکاری کر آتا ہے
برادری میں اس کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اپنی بیوی کے
ساتھ اس کا سلوک اچھا نہیں رہا کیونکہ وہ اس کے جوڑ کی
نہیں۔ ارشد زندہ دل، خوش باش اور دوسروں کے کا
میں بھاگ دوڑ کرنے والا انسان ہے۔ اس کے برعکس اس کی
بیوی چپ چاپ، منہ بسورنے والی اور دوسروں کے کام پر

دخل نہ دینے والی عورت ہے۔ ارشد خوبصورت جوان ہے اور
اس کی بیوی عام سی شکل و صورت والی ہے۔ یہ شادی برادری کی
پابندیوں کے تحت ہوئی تھی۔ ارشد کو یہ رشتہ بالکل پسند نہیں تھا
لیکن برادری کی خوشنودی کے لیے اُس نے یہ رشتہ قبول کیا اور
نبھانے کی بھی کوشش کی۔

یہ کوچوان ارشد کا معتمد ملازم تھا۔ ارشد کی ذاتی زندگی کے
متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔ چند ایک واقعات سنا کر اس نے
ثابت کیا کہ ارشد میں غیر معمولی دلیری ہے اور وہ خطرہ مول
لینے والا آدمی ہے۔ مقتول کی بیوی اس کی قریبی رشتہ دار تھی۔
گھروں میں آنا جانا تھا۔ ارشد کی بیوی جب ارشد کے پاس ہوتی
تھی تو مقتول کی بیوی اس کے گھر آتی تھی۔ گھر میں برادری کی
کتنی ہی قریبی رشتہ دار عورت کیوں نہ آئے، ارشد اندر نہیں
جاتا تھا۔ سلام دعا کے بعد دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا لیکن
مقتول کی بیوی جب آتی تھی وہ اس کے پاس ضرور بیٹھتا تھا۔
زیادہ تر ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ ارشد کی بیوی ان کے ساتھ ضرور
بیٹھتی تھی لیکن اُن کے ہنسی مذاق میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔

پھر برادری میں یہ خبر سنائی دینے لگی کہ میجر (مقتول) کی
اپنی بیوی کے ساتھ اَن بن ہو گئی ہے۔ پھر یہ خبر مشہور ہو گئی کہ
میجر کی بیوی اور ارشد کے تعلقات ایسے ویسے ہو گئے ہیں۔

کوچوان کئی بار ارشد کو تانگے میں میجر کے بنگلے میں لے گیا۔ میجر کبھی گھر ہوتا تھا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ تین چار بار ارشد مقتول کی بیوی کو اُس کے گھر سے اسی تانگے پر سینما دکھانے لے گیا تھا۔

کوچوان نے اپنی رائے یہ دی کہ اس نے انہیں نازیبا حرکتیں کرتے کبھی دیکھا تو نہیں لیکن اُن کی دوستی پاک بھی نہیں تھی۔ ارشد کی بیوی جب اپنے میکے چلی جاتی تھی تو مقتول کی بیوی ارشد کے پاس ضرور آتی تھی۔

کوئی دو مہینے ہوئے ارشد نے کوچوان کو بتایا کہ یار! اُس حرام زادے میجر نے اپنی بیوی کو گھر سے نکال دیا ہے۔ کوچوان جانتا تھا کہ وجہ کیا ہے۔ مقتول کی بیوی گھر آ گئی تو کبھی ارشد اُس کے گھر جاتا اور کبھی وہ ارشد کے گھر آ جاتی۔ اس دوران ارشد اور اس کی بیوی میں جھگڑا چل پڑا۔ وہ مقتول کی بیوی کا ارشد کے ساتھ دوستانہ پسند نہیں کرتی تھی۔ ارشد نے تنگ آ کر اپنی بیوی کو میکے بھیج دیا۔

اس کے بعد مقتول کی بیوی نے ارشد کے پاس آنا کم کر دیا۔ ارشد اُسے ملنے کے لیے بیتاب رہنے لگا۔ پیغام رسانی کا کام یہی کوچوان کرتا تھا۔ ارشد اسے کسی اور کام سے مقتول کے گھر بھیجتا۔ کوچوان موقع پیدا کر کے مقتول کی بیوی کو کہہ آتا کہ ارشد بلا رہا ہے۔ ارشد کی بیوی جب گھر ہوتی تھی تو مقتول کی

ی ارشد کا اشارہ ملتے ہی آ جاتی تھی مگر ارشد کی بیوی کے چلے ے کے بعد اگر اُسے ارشد کے چار پیغام ملے تو وہ ایک بار آتی اور منٹ بیٹھ کر چلی گئی۔ ایک بار مقتول کی بیوی نے یہ کہہ کر ں کر دیا کہ پہلے اپنی بیوی کو گھر لاؤ، پھر میں بھی آ جاؤں گی۔ بہت بُری بُری باتیں کر رہے ہیں۔

اس کے جواب میں ارشد نے اُسے یہ پیغام بھیجا کہ ہم دونوں رادری جھوٹی تہمتیں لگا رہی ہے۔ اگر تم دوستی ختم کرنے یصلہ کر چکی ہو تو میں برادری میں یہ مشہور کر سکتا ہوں کہ تم ں خاطر میجر کو چھوڑنا چاہتی ہو اور میرے تمہارے تعلقات نہیں۔ یہ جواب سُن کر مقتول کی بیوی ارشد کے گھر چلی گئی۔ کو معلوم نہیں تھا کہ اندر اُن کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ اس نے یہ دیکھا کہ ارشد نے دروازہ اندر سے بند کر تھا اور دونوں کم و بیش دو گھنٹے اندر رہے۔ مقتول کی بیوی باہر نکلی تو اُس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ کچھ پریشان نظر آتی تھی۔ کوچوان نے یہ بھی دیکھا کہ ارشد کی قمیض پر ہ کے بائیں طرف سرخ نشان تھے۔ یہ نشان مقتول کی بیوی لپ سٹک کے تھے۔ یہ جوان سال اور خوبصورت عورت ہ نہیں لیتی تھی۔ کوچوان اُسے تانگے میں گھر چھوڑ آیا۔

کوچوان نے مجھے بیان دیتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس

سے پہلے اُس نے اس عورت کو اس حالت میں کبھی نہیں
تھا۔ وہ خوش خوش آتی تھی اور خوش خوش چلی جاتی تھی۔ اب
اداس سی آئی اور پریشانی کے عالم میں گئی۔ کوچوان اسے
کر واپس آیا اور اُس کمرے میں گیا جہاں ارشد اور یہ عورت
رہے تھے، وہاں بڑے صوفے کے پاس اُسے ٹوٹی ہوئی
چوڑی کے ٹکڑے ملے۔

کوچوان نے بیان میں ایسے دو اور واقعات ریکارڈ
ارشد اُسے علم کے انداز سے پیغام بھیجتا تھا اور وہ حیران
آجاتی تھی۔ اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ ارشد ا
بلیک میل کر رہا تھا۔ بہرحال مجھے ابھی یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا
عورت قتل میں شریک ہے؟ — کوچوان کو اس کے متعلق
علم نہیں تھا۔

برادریوں میں جب کسی پر تہمت لگتی ہے تو اُس کا جینا
دوبھر ہو جاتا ہے لیکن اس برادری میں ارشد نے ایسا مقام پیدا ک
تھا کہ لوگ اس سے ڈرتے بھی تھے اور اُس کی عزت بھی کرتے
بہت سے لوگ تو اس کے احسان مند تھے۔ ارشد اور مقتول
بیوی کے گھرانے امیر کبیر جاگیرداروں اور زمینداروں کے
گھرانے تھے۔ انہوں نے انگریزوں کو "وار فنڈ" (جنگی فنڈ
بے دریغ چندہ دے کر بھی سوسائٹی میں مقام پیدا کر رکھا

جاگیرداری، دولت اور سوشل حیثیت تین ایسے پردے تھے
جن کے پیچھے ان لوگوں کے سارے گناہ چھپ جاتے تھے۔ اس
کلاس کی ذہنیت کا یہ عالم تھا (اور اب بھی ہے) کہ ان کی بہو بیٹیوں
کے راز داں ان کے نوکر چاکر ہوتے تھے۔

ایک روز ارشد نے کوچوان کے ہاتھ میں دس دس روپے
کے دس نوٹ دیئے اور کہا — "یہ گنو اور جیب میں ڈال لو۔
یہ تمہاری دولت ہے۔"

۱۹۴۱ء کا ایک سو روپیہ ۱۹۷۹ء کے ڈیڑھ ہزار روپے کے
برابر تھا۔ ایک غریب نوکر کے لیے ایک سو روپیہ واقعی دولت
تھی۔ ارشد نے اسے کہا کہ آج رات میجر (مقتول) کے بنگلے میں
چلنا ہے لیکن تم جو کچھ دیکھو اس کا کسی کے ساتھ ذکر نہ کرنا ورنہ
تم دنیا کے تختے پر نہیں رہو گے۔

رات کے پہلے پہر کوچوان اُسے تانگے میں چھاؤنی لے گیا۔
بنگلے کے سامنے والی سڑک بڑی تھی۔ اس پر جانے کی بجائے
ارشد تانگہ پچھلی طرف لے گیا جہاں سڑک چھوٹی تھی اور اکثر
رات کو سنسان پڑی رہتی تھی۔ بنگلے سے تھوڑی دور تانگہ
رکوا کر ارشد نے کوچوان سے کہا کہ تانگہ دائیں کو موڑ کر بنگلے کے
پہلو والی سڑک پر کھڑا کر دو۔ میں بنگلے کے پچھواڑے سے باہر
آؤں گا۔ تمہیں آواز دوں گا۔ تم تانگہ لے آنا۔ ارشد دراصل

احتیاطی تدابیر اختیار کر رہا تھا۔ کوچوان نے بتایا کہ ارشد گھوم کر
کے سامنے والے پھاٹک سے اندر گیا۔ کوچوان تانگہ بنگلے کے
والی سڑک پر لے گیا۔

شاید نصف گھنٹہ گزرا ہوگا کہ بنگلے کے پھاٹک میں ایک
داخل ہوئی اور ذرا آگے جا کر رک گئی۔ فوراً ہی ارشد کو کوچوان
فصیل پھلانگتے دیکھا۔ اس نے کوچوان کو آواز دی اور سڑک
قریب جا کھڑا ہوا۔ کوچوان نے تانگے کا منہ دوسری طرف کر ر
تھا۔ اس نے جلدی سے تانگہ گھمایا اور ارشد کے قریب لے
جا کھڑا کیا۔ ارشد تیزی سے پچھلی سیٹ پر بیٹھا اور بولا ”جلدی“

وہ جب گھر پہنچے تو کوچوان نے دیکھا کہ ارشد کی شلوار، قمیض
اور واسکٹ پر خون کے چھینٹے تھے۔ اس نے شلوار کی نال
کمانی دار چاقو نکالا اور کوچوان سے کہا — ”چاقو اچھی طرح دھو
اور یہ کپڑے ابھی دھوبی کو دے آؤ۔“

کوچوان سمجھ گیا کہ ارشد میجر کو قتل کر آیا ہے۔ اس نے ارشد
پوچھا — ”کسی نے وہاں آپ کو دیکھا تو نہیں؟ ایک کار اندر گ
تھی۔ وہ کیا آپ کے آدمی تھے؟“

ارشد نے فاتحانہ لہجے میں کہا — ”وہ معلوم نہیں کون تھے
کوئی مجھے دیکھ لیتا تو اسے بھی میں ادھیڑ ڈالتا۔“

کوچوان نے پہلے چاقو دھویا پھر خون آلود کپڑے دھوبی کے

پاس لے۔ جانے لگا تو ارشد نے اسے روک کر کہا — ”کپڑے
کہیں چھپا دو۔ کل دے آنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی نے ہمیں دیکھ لیا
ہو اور تم راستے میں پکڑے جاؤ۔“

قتل ایک ایسا بھیانک جرم ہے کہ پیشہ ور اور منجھے ہوئے
قاتل بھی غلطی سے پیچھے ایسا سراغ چھوڑ جاتے ہیں کہ پولیس ان
کا سراغ لگا لیتی ہے، بشرطیکہ تفتیش کرنے والا انسپکٹر گہری نظر
اور تفتیش میں گہری دلچسپی رکھتا ہو۔ ارشد پیشہ ور نہیں تھا۔
اس نے اپنی دولت کے نشے میں اور اپنی لاف زنی کے جھوٹے
طلسم میں گرفتار ہو کر یہ واردات کی تھی۔ وہ اناڑی تھا۔ عقل
اس کا ساتھ دیتی تو وہ خون آلود کپڑے خود ہی دھو لیتا یا
کوچوان سے کہتا تو کپڑے گھر میں ہی صاف ہو سکتے تھے مگر وہ
اپنے آپ کو دھوبیوں، موچیوں، نائیوں اور مزارعوں کا بادشاہ
سمجھتا تھا مگر انسانی خون نے اس سے انتقام لینے کے لیے اس
کی عقل پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اتفاق سے میں نے ترقی یافتہ ممالک کے
ماہرین نفسیات کی دو چار کتابیں پڑھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قتل ایسا
جرم ہے جسے انسانی ضمیر برداشت نہیں کر سکتا۔ خود قاتل کا ضمیر جو ہر
قسم کے چھوٹے بڑے گناہ کا بوجھ اٹھا لیتا ہے، قتل کے بوجھ کو
قبول نہیں کرتا۔ قاتل لاشعوری طور پر موقعہ واردات پر اپنا کوئی نہ
کوئی سراغ چھوڑ جاتا ہے یا واردات کے بعد ایسی حرکت کر ہی گزرتا ہے

کہ پکڑا جاتا ہے۔ یہ ضمیر کی انتقامی کارروائی ہوتی ہے۔

ایسی ہی حرکت ارشد نے کی۔ وہ کوچوان کے بغیر بھی قتل کر سکتا تھا۔ خون آلود کپڑے گھر میں دھو یا دُھلوا سکتا تھا مگر قدرت کے جس انتقامی نظام نے انسان کے اندر ضمیر رکھ دیا ہے اُس نے اُسے احمق بنا دیا تھا۔ احمق بھی اس حد تک بنایا کہ کپڑے اگلے روز دھلنے کے لیے رکھ لیے۔ اُس نے یہ بھی نہ سوچا کہ چوبیس گھنٹوں بعد داغ پکے ہو چکے ہوں گے۔ واسکٹ کا گرم کپڑا ایسا تھا جس سے پرانا داغ اُترنا خاصا مشکل تھا۔

دوسرے دن ارشد نے کوچوان کو بتایا کہ وہ اپنی بیوی کو راضی کرکے گھر لا رہا ہے۔ اُسی روز برادری میں کہرام مچ گیا۔ خبر ملی کہ میجر اپنے بنگلے میں قتل ہو گیا ہے۔ مقتول اسی برادری کا آدمی تھا۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنا تبادلہ اس چھاؤنی میں کرایا تھا۔ یہاں اُس کا گھر تھا۔ برادری کے لوگ مقتول کے بنگلے اور پھر ہسپتال کی طرف دوڑ پڑے۔ لاش ہسپتال جا چکی تھی۔ ارشد بھی ان لوگوں کے ساتھ تھا بلکہ سب سے آگے تھا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے بعد لینے میں وہ پیش پیش تھا۔ وہ للکارتا تھا ـــــ "میں اس میجر کے خون کا بدلہ ایک درجن آدمی قتل کرکے لوں گا۔"

مجھے یاد آیا کہ مجھے ارشد نے کہا تھا کہ اس لڑکی کی خاطر میں ایسے ایک درجن میجر قتل کر سکتا ہوں۔ کوچوان نے بیان دیا کہ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ قاتل ارشد ہے اور مقتول کا خون ابھی تک اس کے گھر میں پڑا ہے۔ رات کو کوچوان خون آلود کپڑے دھوبی کو دے آیا مگر داغ پوری طرح نہ اُتر سکے۔ اگلی صبح میجر کو دفن کر دیا گیا۔

چار روز بعد ارشد نے مقتول کی بیوی کو اپنے گھر بلایا۔ اس عورت کی حالت بہت بُری تھی۔ رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور رو رو کر اس کی آنکھیں سُوجی ہوئی تھیں۔ کوچوان کو بالکل معلوم نہیں تھا کہ ارشد اور اس عورت کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ مقتول کی بیوی باہر نکلی تو وہ زیادہ پریشان تھی۔ کوچوان اُسے گھر چھوڑ آیا۔ اس کے بعد ارشد اپنی بیوی کو گھر لے آیا۔ کوچوان کے کہنے کے مطابق ارشد نے اپنی بیوی کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ کل صبح سے اس کی بیوی کو اچانک کوئی تکلیف ہو گئی ہے۔ کہتی ہے کہ سر اس طرح جکڑا ہوا ہے جیسے شکنجے میں کس دیا گیا ہو۔ دل ڈوبنے کی شکایت بھی کرتی تھی۔ کل صبح سے وہ بستر سے اٹھی ہی نہیں۔

قاتل کی بیوی بھی....

کوچوان نے جب اس عورت کی بیماری کا ذکر کیا تو میں نے اس

سے پوچھا — "ارشد اس کے لیے دوائی لایا تھا؟"

"نہیں" — کوچوان نے جواب دیا — "بلکہ اس کی بیوی نے مجھے کہا تھا کہ اسے دوائی لا دوں مگر میں نے ارشد سے کہا تو اُس نے بے پرواہی سے کہا کہ تم رہنے دو۔ میں خود ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔ آج اس وقت تک جب آپ ہمیں ملے ڈاکٹر بھی نہیں آیا، دوائی بھی نہیں آئی۔ اسے تکلیف کل کی نسبت زیادہ ہے"

میں نے ارشد کے سسر سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو جا کر دیکھے، اور اگر کوئی گڑبڑ نظر آئے تو مجھے بتائے۔ وہ رات تک تھانے میں نہ آیا۔ اگلی صبح جب میں ارشد کا ریمانڈ لے کر اور کوچوان کا بیان ریکارڈ کرنے کے بعد اُسے جوڈیشل حوالات میں بھجوا کر تھانے میں آیا تو ارشد کا سسر برآمدے میں بیٹھا تھا۔ اُس نے غالباً ارشد کو حوالات میں نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

اُس نے بتایا — "کل تین چار بجے کے درمیان ارشد کے گھر گیا۔ میری بیٹی (ارشد کی بیوی) بستر پر پڑی ہائے ہائے کر رہی تھی۔ کہتی تھی کہ سر پھٹ رہا ہے اور سینہ جل رہا ہے۔ اُس نے ارشد کے متعلق بتایا کہ اُس نے اسے کوئی دوائی نہیں دی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ صبح اُس نے تانگہ تیار کرایا اور یہ کہہ کر نکل گیا کہ ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں۔ ابھی واپس نہیں آیا"

ارشد کے سسر نے آگے چل کر یہ بتایا — "میں نے رات تک ارشد کا انتظار کیا۔ رات آٹھ بجے تک نہ وہ خود آیا نہ تانگہ واپس آیا۔ میں آخر تنگ آ کر چھاؤنی کے ڈاکٹر بہاری چند کے پاس چلا گیا۔ وہ میرے ساتھ آ گیا۔ لڑکی کی حالت دیکھی تو اُس نے اپنے کمپاؤنڈر کے ہاتھ ایک انجکشن منگوا کر دیا۔ دوائیاں بھی دیں اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ صبح تک سنبھل جائے گی، مگر اب اُس کی حالت اور زیادہ بگڑ گئی ہے۔ کہتی ہے کہ سینہ اور انتڑیاں جل رہی ہیں۔ ڈاکٹر بہاری چند نے آ کر دیکھا تو اُس نے کوئی دوائی نہ دی۔ یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہ ہسپتال کا کیس ہے۔ میں اسے سول ہسپتال میں داخل کرا آیا ہوں۔ اب اُسے ابکائیاں آتی ہیں۔ دوائی بھی اندر نہیں ٹھہرتی۔ میں حیران ہوں کہ ارشد ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اُس کا تانگہ بھی نہیں آیا۔ میں نے اُس کے باپ کو اطلاع دے دی ہے"

مجھے یہی توقع تھی۔ تھانیداری کی چھٹی حس نے مجھے یہی اشارہ دیا تھا۔ ارشد نے میجر کو راستے سے ہٹا دیا تھا۔ اب اُس نے راستے کا دوسرا پتھر ہٹانے کا بھی بندوبست کر دیا تھا۔ میں نے ارشد کے سسر کو یہ نہیں بتایا کہ ارشد میری حوالات میں بند ہے۔ میں نے اُسی وقت ارشد کے سسر کو ساتھ لیا اور بھاگم بھاگ سول ہسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر سے ملا اور اُسے دفتر

سے اُٹھا کر مریضہ کے پاس لے گیا۔

مریضہ کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب تھی جتنی اُس کے باپ نے بتائی تھی۔ اندر کی بے چینی سے جیسے وہ جلن کہتی تھی، وہ تڑپ رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے اس کی تشخیص کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ معدے میں کوئی اچانک گڑبڑ ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ملیریا ہو گیا ہے۔

وہ میڈیکل اصطلاحیں بولنے لگا تو میں نے اُسے پرے لے جا کر کہا ــــ "اس خاتون کا نزعی بیان لے لیں۔"

"نزعی بیان؟" ــــ اُس نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی، نزعی بیان" ــــ میں نے کہا ــــ "اس نے اگر قے کی ہے تو اگالدان کو میں سر بمہر کر کے معائنے کے لیے بھجوا دیتا ہوں۔ لڑکی کو خاوند نے زہر دیا ہے۔"

میں نے اُسے پس منظر بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ لڑکی کو یہ نہیں بتایا جائے گا کہ خاوند نے اُسے زہر دیا ہے۔ میں سوال کرتا جاؤں گا اور آپ اس کے جواب نوٹ کرتے رہیں۔

ہم لڑکی کے پاس بیٹھ گئے۔ مجھے دیکھ کر وہ گھبرائی۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں وردی میں تھا۔ میں نے اُس کی گھبراہٹ کو بھانپتے ہوئے اُسے کہا ــــ "تمہارے والد صاحب نے تھانے میں رپورٹ دی ہے کہ تمہارا خاوند کل صبح تانگے پر سوار ہو کر باہر

گیا تھا، ابھی تک واپس نہیں آیا۔ میں تم سے پوچھنے آیا ہوں کہ وہ کس وقت گھر سے نکلا تھا اور کس کام سے گیا تھا۔ تم گھبراؤ نہیں۔ وہ بچہ نہیں جو گم ہو جائے گا۔"

"وہ مجھے کہہ گئے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں" ــــ لڑکی نے جواب دیا۔

اس کے بعد میں اس سے جو کچھ پوچھتا رہا وہ بتاتی رہی۔ ڈاکٹر اس کے جواب لکھتا رہا۔ میرے سوالوں کی ترتیب ایسی تھی کہ اُس کے جوابوں سے نہایت ہی کارآمد اور رواں بیان بن گیا۔ لڑکی لکھ پڑھ سکتی تھی۔ اُس نے بیان پر دستخط کر دیئے۔ میں نے اُس کا انگوٹھا بھی لگوا لیا۔ اس کا بیان مختصراً یہ تھا کہ سمجھوتے کے بعد ارشد اُسے گھر لے آیا اور خلافِ توقع اچھا سلوک کرنے لگا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے میجر (مقتول) کی بیوی کے ساتھ تعلقات توڑ لیے ہیں۔ ارشد کھانا اکیلے کھایا کرتا تھا۔ ناشتہ بھی اکیلے کیا کرتا تھا، حالانکہ گھر میں صرف میاں بیوی تھے۔ بیوی باورچی خانے میں ہی کھا پی لیتی تھی۔

کل صبح بیوی اُس کے لیے ناشتہ لے کر گئی تو ارشد نے اُس سے پوچھا کہ ناشتہ کر لیا ہے یا نہیں۔ بیوی نے ابھی ناشتہ نہیں کیا تھا۔ ارشد نے اسے کہا کہ آج سے ہم اکٹھے کھانا کھایا کریں گے، جاؤ اپنا ناشتہ یہیں لے آؤ۔ سیدھی سادی بیوی بہت خوش

ہوئی۔ وہ اپنا ناشتہ بھی اٹھا لائی۔ ارشد نے اُسے کہا "کچھ تھوڑا سے اور لے آؤ"۔ بیوی مکھن لینے چلی گئی۔

واپس آئی تو ارشد دونوں پیالیوں میں چائے بنا چکا تھا بیوی نے چائے کا ایک گھونٹ پیا تو کہنے لگی کہ آج چائے کا ذائقہ کچھ ترش سا ہے۔ ارشد نے اپنی پیالی سے گھونٹ پیا اور مسکرا کر کہا "یہ نہ چائے کا قصور ہے نہ تمہارا۔ میری چائے بھی ایسی ہی ہے۔ شہر میں یہ بڑی تنگی ہے۔ نلکوں کا پانی ٹینکیوں سے آتا ہے۔ کبھی کبھی اِن ٹینکیوں میں جراثیم مارنے کے لیے دوائی ڈال دیتے ہیں۔ یہ اس دوائی کا ذائقہ ہے۔ گھر کی تینوں ٹوٹیاں کھول دینا۔ یہ ذائقہ نکل جائے گا"۔

بیوی نے مان لیا۔ وہ اس خوشی میں مدہوش ہو کر چائے کی پوری پیالی پی گئی کہ ارشد نے اُسے کہا ہے کہ اب ہم اکٹھے کھانا کھایا کریں گے۔ اس سے ایک آدھ گھنٹے بعد اسے سر میں گرانی محسوس ہوئی۔ پھر اس کا سر چکرا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا دل ڈوبنے لگا۔ سر کی حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ جسم اتنا کمزور ہو گیا کہ وہ لیٹ گئی۔ پہلے اس نے ارشد کو بتایا کہ اس کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ اس نے کہا دوائی لا دوں گا لیکن دوائی لینے نہیں گیا۔ کوچوان اندر آیا۔ بیوی نے اسے کہا کہ کسی ڈاکٹر سے دوائی لا دے۔ وہ بھی دوائی نہیں لایا۔ اس کی حالت یہ ہو گئی کہ پیٹ

اور سینے میں جلن شروع ہو گئی۔

اس نے ارشد کو ایک بار پھر دوائی کے لیے کہا تو اس نے کہا اچھا لا دوں گا۔ اس کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے یا اُسے بیوی کی حالت کا احساس نہیں کہ کتنی خراب ہے۔ آخر وہ اٹھی۔ فرنیچر اور دیواروں کے سہارے ارشد کے کمرے میں گئی۔ وہ بڑے آرام سے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ بیوی نے اسے رو کر کہا کہ کوچوان سے کہو کہ مجھے تانگے پر کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس نے بیوی کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اچانک تیزی سے اٹھا۔ بیوی کو سہارا دے کر سونے والے کمرے میں لے گیا۔ اسے بستر پر لٹا کر کہا کہ ڈاکٹر کو میں یہیں لے آتا ہوں مگر وہ واپس ہی نہیں آیا۔ دن کے پچھلے پہر اس کا باپ اس کے گھر گیا۔ وہ گھر میں اکیلی پڑی تڑپ رہی تھی۔ باپ بھی اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ ارشد ڈاکٹر کو لے کر آئے گا۔

اس کے بعد اس نے وہی بیان دیا جو اس کا باپ مجھے بتا چکا تھا۔ ہم نے لڑکی کو یہ نہیں بتایا کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ میں نے ابھی شک پر اس کا بیان دلوایا تھا۔ یہ شک پختہ تھا مگر یقین نہیں تھا۔ حالات بتا رہے تھے کہ اسے زہر دیا گیا ہے۔ اُس وقت تک لڑکی دو بار قے کر چکی تھی۔ ڈاکٹر نے اگالدان اٹھوا کر اپنے دفتر میں بھجوا دیا اور انجکشن لگانے والی سرنج سے اس کی رگ سے تھوڑا سا خون

بھی نکال لیا۔

یہ بدنصیب لڑکی ارشد کے لیے پریشان تھی۔ اس نے وردی کہا کہ وہ جوں ہی آئیں انہیں ہسپتال بھیج دینا۔ ڈاکٹر نے فوراً انجکشن دیئے۔ لڑکی کے باپ کی پریشانی قدرتی امر تھا۔ ڈاکٹر لڑکی کو تسلی دی۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ لڑکی وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔ میں ڈاکٹر کے ساتھ وارڈ سے نکل گیا کا باپ ہمارے پیچھے آیا۔ ہم نے اِسے بھی تسلّی دی اور کہا لڑکی کے پاس رہو۔

ڈاکٹر نے اُگالدان میں سے تھوڑا سا مواد ایک ٹیسٹ ٹیوب میں ڈالا۔ اس کا منہ کارک سے بند کیا۔ دوسری ٹیسٹ ٹیوب میں لڑکی کا خون ڈالا۔ اسے بھی کارک سے بند کیا اور ایک ڈبے میں بہت سی روئی رکھ کر دونوں ٹیوبیں احتیاط سے پیک کر دیں۔ پارسل کرایا اور اسے لاکھ سے سربمہر کر کے کیمیکل ایگزیمینر کے لیے تیار کر دیا۔ لڑکی کے بیان کو اُس نے لفافے میں بند کر کے لفافہ سربمہر کیا اور اپنے پاس محفوظ رکھ لیا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ لڑکی کے بچنے کی کوئی اُمید ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اگر اس کی تشخیص صحیح ہوتی تو فکر والی کوئی بات نہیں تھی۔ اب تو صورت ہی کچھ اور پیدا ہو گئی ہے۔ اگر یہ زہر ہے تو چھبیس گھنٹوں میں زہر اپنا کام کر چکا ہے۔ اب لڑکی کا

ممکن نظر نہیں آتا۔ پھر بھی اسے بچانے کی پوری کوشش کی جائے گی۔

میں تھانے چلا گیا۔ ارشد حوالات میں بند دروازے کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔ اُس نے مجھے آواز دی۔ میں اس کے سامنے جا کھڑا ہُوا۔

"ملک صاحب!" اُس نے کہا۔ "مجھے یہاں بند کر کے آپ شاید بھول گئے ہیں۔ میرا جرم تو بتا دو۔"

"دوہرا قتل" ۔۔۔ میں نے جواب دیا ۔۔۔ "میں تمہیں موقع دے رہا ہوں کہ اندر بیٹھ کر اطمینان سے سوچ لو اور مجھے خود ہی سب کچھ بتا دو۔ مجھے اب تمہارا بیان لینے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا کوچوان بالکل صحیح بیان دے کر جیل چلا گیا ہے اور تمہاری بیوی کا نزعی بیان ڈاکٹر نے لے لیا ہے۔ تمہاری شلوار، قمیض اور واسکٹ میرے قبضے میں ہے۔ دھوبی داغ نہیں اتار سکا۔"

اُس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں وہاں سے چل پڑا۔ مجھے اس کی سسکی سی سنائی دی ۔۔۔ "ملک صاحب!" ۔۔۔ پھر اس کی آواز سنائی دی ۔۔۔ "ملک احمد یار خان صاحب! ایک منٹ رکنا۔"

کچھ میری غلطیاں

لیکن میں رکا نہیں۔ میں اُسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اے۔ ایس۔ آئی رگھبیر سنگھ کو میں نے ساری کارگزاری

سنائی اور اُسے کہا — " ذرا اسے (ارشد کو) چھیڑتے رہو" چھ
سے میری مراد یہ تھی کہ دوستانہ طریقے سے معلوم کرو کہ اس کا
ارادہ ہے۔

مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ ارشد کی بیوی کا بیان لیتے وقت میں یہ پوچھنا بھول گیا تھا کہ آیا چائے کے برتن دُھل گئے تھے یا نہیں۔ اس کے بیان کے مطابق وہ ناشتے کے ذرا ہی بیمار پڑ گئی تھی۔ معلوم نہیں گھر میں نوکرانی تھی یا نہیں۔ ہو سکتا تھا کہ برتن نہ دُھلے ہوں اور پیالی میں کچھ بچی ہوئی چائے میرے ہاتھ آ جاتی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ شہادت اور ثبوت فراہم کروں میجر کے قتل کے موقعے کا کوئی گواہ نہ تھا۔

مجھ سے دوسری غلطی یہ ہوئی کہ ارشد اور اس کے کوچوان کو تو حراست میں لے لیا لیکن مکان کی تلاشی نہ لی۔ آلۂ قتل فوراً برآمد ہونا چاہیے تھا۔ یہ کارروائی تو اب بھی ہو سکتی تھی لیکن اب برآمدگی اس لیے مخدوش ہو گئی تھی کہ ارشد کے کسی ہمراز رشتہ دار، دوست یا ساتھی ملزم نے آلۂ قتل اڑا لیا ہو گا۔ بہرحال میرا ذہن اس پیچ در پیچ کیس کے دوسرے پہلوؤں میں ایسا اُلجھا رہا کہ میں کچھ غلطیاں یا کوتاہیاں کر بیٹھا۔

اب میں شہادت کے متعلق سوچنے لگا۔ سلطانی گواہ مل جانے سے میں مطمئن نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس کے بیان کو صحیح ثابت کرنے

کے لیے ٹھوس ثبوت کی ضرورت تھی اور یہ خطرہ بھی تھا کہ سلطانی گواہ کورٹ میں جا کر منحرف ہو جائے گا۔ ایسا اکثر ہوتا ہے کہ اقبالی بیان دے کر یا سلطانی گواہ بن کر ملزم کورٹ میں منحرف ہو جاتے ہیں۔ بعض تھانیدار ان پر بھروسہ کر کے دیگر شہادت اور ثبوت کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کیس تباہ ہو جاتا ہے۔ ملزم شک میں بری کر دیئے جاتے ہیں۔ میں ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ارشد کو میں ابھی کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس سے پہلے میں نے مقتول کی بیوی کا بیان لینا ضروری سمجھا۔

میں کیل کانٹے سے لیس ہو کر ارشد پر حملہ کرنا بہتر سمجھتا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح ارشد کے باپ کو اطلاع مل گئی کہ ارشد تھانے میں بند ہے۔ میرے کسی کانسٹیبل نے دو چار روپوں کے لالچ میں اطلاع دی ہو گی۔ اُس کا باپ دس بارہ آدمیوں کو ساتھ لے کر تھانے میں آ گیا۔ میں نے انہیں باہر کھڑا کر کے رگھبیر سنگھ سے کہا کہ چار کانسٹیبل لاٹھیوں سے مسلح ساتھ لو اور ارشد کے مکان پر پہرہ لگا دو۔ گھر میں جو کوئی بھی ہے اُسے باہر نکال دو۔ اس کارروائی کو قانونی طور پر پختہ اور مؤثر بنانے کے لیے چاہیے تو یہ تھا کہ ایک مجسٹریٹ کو ساتھ لے کر مکان سر بمہر کرا دیتا لیکن میں نے ایک دھاندلی کی تاکہ وقت ضائع نہ ہو اور مکان سے کوئی کام کا ثبوت تلف نہ ہو جائے۔

رگھبیر سنگھ فوراً چار کانسٹیبلوں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ میں نے ارشد

کے باپ کو بتایا کہ اُس کا بیٹا میجر کے قتل میں زیرِ حراست ہے اور کوجوان کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ارشد کے باپ نے ضمانت کے لیے کہا۔ جاگیرداری کا رعب جھاڑا۔ مجھے ڈپٹی کمشنر (جو انگریز تھا) سے ملنے کی دھمکی دی۔ ارشد سے ملاقات کے لیے کہا۔ میں نے یہ سب کچھ تحمّل سے سنا اور اُسے جواب دیا کہ آپ تھانے میں سے تشریف لے جائیں اور باہر جا کر جو بہتر سمجھتے ہیں کریں۔ کورٹ میں ضمانت کی درخواست دیں اور انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہیں کہ وہ ۳۰۲ کے ملزم کی ضمانت کرا دے۔ اس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے وہ تو مرنے مارنے پر تُلے ہوئے تھے۔ ہر بات دھمکی کے لہجے میں کرتے تھے۔ انگریزی راج پر انہیں بہت ہی ناز تھا۔ وہ غصّے میں دندناتے چلے گئے۔

انگریز بادشاہ اُن پر واقعی بہت خوش تھا۔ ایک گھنٹے کے بعد ڈپٹی کمشنر کا فون آ گیا۔ وہ خود بول رہا تھا۔ وہ ویسٹ میکاٹ کے نام کا بڑا ہی جابر افسر تھا۔ ارشد کا باپ اُس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے کیس کے متعلق پوچھا۔ میں نے اُسے سارا کیس بتا دیا۔ یہ بھی بتایا کہ میں نے ارشد کو محض شک پر نہیں پکڑا۔ وہ ایک قتل کر چکا ہے اور اپنی بیوی کو زہر دے چکا ہے جو شاید کل تک زندہ نہ رہے۔ اس انگریز ڈپٹی کمشنر کو بھڑکانے کے لیے میں نے یہ بھی کہا کہ ملٹری پولیس نے

جاسوسوں کا ایک گروہ پکڑا ہے جس کی تفتیش میں میں بھی شامل ہوں۔ مقتول اس گروہ کا سرکردہ ممبر تھا۔ وہ عین اُس وقت قتل ہُوا جب اس نے مجھے اقبالِ جرم کے لیے اپنے بنگلے میں بلایا تھا۔ مجھے شک ہے کہ ارشد کا بھی اس گروہ کے ساتھ تعلق ہے۔

انگریز قتل بخش سکتا تھا، اپنے خلاف جاسوسی کے مجرموں کو بغیر مقدمے کے بھی گولی مارنے سے گریز نہیں کرتا تھا خصوصاً اس صورتِ حال میں جب اُس کی فوجیں فرانس سے بھاگ کر یورپ جرمنوں کے قبضے میں دے آئی تھیں اور اِدھر جاپان کی فوجیں برما میں داخل ہو کر ہندوستان کے لیے خطرہ بن چکی تھیں۔ انگریز جاسوسی کے ملزموں کو نہیں بخش سکتا تھا۔ ڈپٹی کمشنر بھڑک اُٹھا۔ اس نے معذرت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ یہ لوگ "وار فنڈ" میں بہت چندہ دے چکے ہیں اور اب ارشد کا باپ پانچ ہزار روپیہ مزید چندہ لایا ہے، مگر اس کے بیٹے کا جُرم دوہرا قتل اور دوسرا جاسوسی، اس لیے اس کی کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھے ڈانٹ کر کہا — "یہ لوگ روپے پیسے والے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم رشوت لے کر کیس کمزور کر دو۔"

ڈپٹی کمشنر کے پاس ان لوگوں کے جانے اور "وار فنڈ" میں پانچ ہزار روپیہ چندہ دینے سے مقصد یہ تھا کہ وہ ارشد کو ضمانت پر رہا کرا دے اور تھانیدار پر رعب قائم کر دے۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ

اس ڈپٹی کمشنر نے ارشد کے باپ کی درخواست پر یہ کارروائی کہ اس سے پانچ ہزار روپیہ چندہ وصول کر لیا اور رسید دے دی۔

مجھے اب مقتول کی بیوی سے ملنا تھا۔ اُس کے خلاف میرا شک متزلزل ہو رہا تھا اور میں اس سوال میں اُلجھ گیا تھا کہ وہ اس قتل میں شریک ہے یا نہیں اور کیا اُس نے ارشد سے کہا تھا کہ وہ اس کے خاوند اور اپنی بیوی کو راستے سے ہٹائے تو وہ اس کے ساتھ شادی کرے گی؟ کسی کے خاوند اور کسی کی بیوی کی جب محبت ہو جاتی ہے تو یہ منظر اس ڈرامے میں تقریباً لازمی ہوتا ہے کہ "غیر ضروری" خاوند یا بیوی یا دونوں پُراسرار طریقے سے قتل ہو جاتے ہیں۔ انجام خواہ کچھ ہی ہو۔ اکثر کیسوں میں یہ ڈرامہ پھانسی کے تختے پر ختم ہُوا کرتا ہے۔ یہاں بھی یہی ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ مقتول کی بیوی کی ایما شامل ہے؟

میں نے اُسے تھانے میں بلانا مناسب نہ سمجھا۔ ایک تو عورت ذات تھی، تھانے سے گھبراتی، دوسرے مسلمان تھی۔ جرم خواہ کتنا ہی گھناؤنا تھا، میں اُسے باعزت ماحول میں دوستانہ طریقے سے ملنا چاہتا تھا تاکہ وہ کھل کر بات کر سکے۔ رات کو بغیر وردی اُس کے گھر جانے کی سوچی تو یہ بھی مناسب نظر نہ آیا کیونکہ یہ برادری بھڑکی ہوئی تھی۔ میں پولیس گارڈ لے کر وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ میرے لیے کسی کے بھی گھر میں، کسی بھی وقت جا دھمکنا اور کسی

کی ماں بہن کو کسی بھی وقت تھانے بلا لینا مشکل نہیں تھا لیکن میرا طریقۂ کار مختلف تھا جو اکثر کامیاب رہتا تھا۔

مقتول کی بیوی — ایک کہانی، ایک گناہ

سوچ سوچ کر میں نے مقتول کی بیوی کے باپ کو تھانے بلایا۔ قدرتی بات تھی کہ وہ گھبراہٹ کے عالم میں آیا۔ ایسی لڑکیوں کے باپ بڑے ہی بدنصیب ہوتے ہیں جن کی شادی شدہ بیٹیاں آشناؤں سے وابستہ ہو جاتی ہیں یا کسی سکینڈل میں ملوّث ہو جاتی ہیں۔ یہ انہی باپوں میں سے تھا۔ میں نے اسے احترام سے بٹھایا اور احترام سے بات کی۔ اِدھر اُدھر کی باتوں سے اُس کے دل سے دہشت نکالی اور پھر مقتول کے متعلق پوچھا۔ ارشد اور اُس کی بیٹی کے تعلقات کے متعلق پوچھا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی بہت وکالت کی جو میرے لیے قابلِ قبول نہیں تھی لیکن اسے وکالت ہی کرنی چاہیے تھی۔

میں نے اُسے ٹوکا نہیں۔ اُس کی تردید بھی نہیں کی بلکہ تائید ہی کرتا رہا۔ ارشد کے متعلق اُس نے بتایا کہ خوش باش اور ڈھیٹ آدمی ہے۔ اس کی باقی رائے وہی تھی جو مجھے دوسروں سے حاصل ہو چکی تھی۔ میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ میں اُس کی بیٹی سے

"کیا آپ دل میں یہ شک لے کے آئے ہیں کہ میں نے اپنے خاوند کو ارشد کے ہاتھوں قتل کرایا ہے؟"

یہ جواں سال عورت غیر معمولی طور پر ذہین تھی۔ مجھے یہ دیکھنا تھا کہ چالاک بھی ہے یا نہیں۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا ــ "ہاں۔ مجھے یہ شک رفع کرنا ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں اور میں تمہیں ایک بار پھر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں بہن کہا ہے"

اُس نے غم میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ سے کہا ــ "بہن بنانا آسان ہے لیکن یہ رشتہ کوئی کوئی مرد نبھاتا ہے۔"

میں نے اُسے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ میں یہ رشتہ نبھاؤں گا بشرطیکہ وہ بھی اس رشتے کا احترام کرے۔

"میں نے سنا ہے کہ ارشد کی بیوی بڑی سخت بیمار ہے" ــ اُس نے کہا ــ "آپ جائیں اور اُسے دیکھیں۔"

"میں کیوں اُسے دیکھوں؟" میں نے انجان بن کر پوچھا۔

"کیونکہ مجھے شک ہے کہ وہ قتل کا دوسرا کیس ہے۔"

"قتل کا دوسرا کیس؟"

"جی!" اُس نے بڑی زہریلی مسکراہٹ سے کہا ــ "ارشد نے اُسے کچھ کھلا دیا ہے۔"

"تم کیسے جانتی ہو؟"

"مجھے شک ہے کہ اُس نے اس معصوم کو ڈنک مار دیا ہے۔"

"تو یہ اُس نے تمہاری خاطر کیا ہوگا؟"

"جی!" اُس نے دانت پیس کر کہا ــ "میری خاطر۔ اُس نے میرا سہاگ اُجاڑ دیا اور اپنا گھر برباد کر دیا ہے۔ میں نے اُسے ایسے تو نہیں کہا تھا۔"

"تم نے کیسے کہا تھا؟"

"وہ میں نے آپ کو بتایا تھا۔" اُس نے جواب دیا ــ "میں اپنے خاوند کو بتانا چاہتی تھی کہ تم عیش کر سکتے ہو تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ میں نے ارشد کو بھائی بنا کر ایک ڈرامہ کھیلا تھا۔" اُس نے لمبی آہ بھری اور کہنے لگی ــ "گھڑی جو گزر جاتی ہے وہ پھر ہاتھ نہیں آتی میں آج پچھتا رہی ہوں کہ میں یہ کیا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔" اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ اُس نے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش نہ کی۔ آنسو بہتے بہتے اُس کی سسکیاں نکلنے لگیں اور پھر وہ ایسی بے قابو ہوئی کہ منہ پر دوپٹہ ڈال کر اور اوپر ہاتھ رکھ کر ہچکیاں لے لے کے روتی رہی۔ بہت دیر روتی رہی۔

میں نے بڑی مشکل سے اُسے سنبھالا۔ تسلی دلاسے دیئے۔ کچھ اُس کے دل کی باتیں کیں۔ وہ سنبھل گئی اور عجیب سے لہجے میں پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ آپ نے اُسے گرفتار کر لیا ہے؟ میں نے آج سنا ہے۔"

"ہاں! میں نے اُسے گرفتار کر لیا ہے۔"

ملنا چاہتا ہوں لیکن اس کی عزت کی خاطر اُسے تھانے نہیں بلانا چاہتا اور نہ دن کے وقت اُس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ آخر یہ طے پایا کہ میں رات نو بجے کے بعد وردی کے بغیر اس کے گھر آجاؤں۔ اُس وقت برادری کا کوئی آدمی وہاں نہیں ہوگا۔

رات کو جب میں اُس کے گھر جانے لگا تو سول ہسپتال ٹیلیفون کیا۔ وہاں کوئی ڈاکٹر نہیں تھا۔ میں نے یہ بتا کر کہ میں کون بول رہا ہوں، کہا کہ مجھے فلاں وارڈ میں فلاں بیڈ کی فلاں نام کی مریضہ کی حالت معلوم کر کے بتاؤ۔ اتفاق سے ایک نوجوان ڈیوٹی ڈاکٹر اسی وارڈ میں موجود تھا۔ اُس نے فون پر آکر بتایا کہ مریضہ کی حالت بہت بُری ہے۔ مسلسل گلوکوز دیا جا رہا ہے مگر رات مشکل سے ہی نکالے گی۔

یہ رپورٹ لے کر میں مقتول کی بیوی سے ملنے چلا گیا۔ اُس کا باپ اُسے ایک کمرے میں میرے پاس بٹھا کر چلا گیا۔ اُس کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ بال بے ترتیب تھے اور چہرے پر گہری اداسی تھی۔ اس سے پہلے میں اُسے ملا تھا تو اُس نے ہلکا ہلکا میک اَپ کر رکھا تھا، بال سنورے ہوئے اور کپڑے بہت اچھے تھے۔ مگر اب اپنے قدرتی رنگ میں اُس کی کشش اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ ارشد جیسا زندہ دل آدمی اُس کی خاطر دو قتل کرنے میں حق بجانب تھا۔ مقتول بڑا ہی بدذوق انسان تھا جس نے اِس عورت پر اُس

ہندو لڑکی کو ترجیح دی تھی۔ حسن و شباب میں ہندو لڑکی بھی کچھ کم نہیں تھی لیکن اس کی اصل کشش اس کے ناز و انداز اور اداکاری میں تھی۔ مقتول پر یہی جادو چل گیا تھا۔

میں اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اصل بات پر آنا چاہتا تھا تاکہ اس کا ذہن اور دل خوف سے آزاد ہو جائے، مگر غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکل گیا — "تمہارے خاوند کو کس نے قتل کیا ہے؟"

"ارشد نے" اس نے بلا توقف کہا۔

اس کے جواب نے مجھے اس طرح چونکا دیا جیسے گہری نیند سے مجھے جگا دیا ہو۔ میں بیدار ہو گیا اور اُس سے پوچھا — "کیا ایمان نے تمہیں بتا دیا ہے کہ میں تھانیدار کی حیثیت سے نہیں بلکہ تمہارے بھائی کی حیثیت سے آیا ہوں؟ میں تمہیں تھانے بلا سکتا تھا۔"

"جی" — اُس نے جواب دیا — "اسی لیے میں نے آپ کو فوراً صحیح جواب دے دیا ہے۔"

"اگر تم مجھے اسی طرح صحیح جواب دیتی رہو گی تو میں تمہارے سر سے دوپٹہ نہیں اُترنے دوں گا" — میں نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اور اس دوپٹے پر ہاتھ بھی رکھ لوں گا۔ یہ ایک بھائی کا وعدہ ہے۔"

"اُس کی بیوی کو دیکھنا" اس نے کہا "وہ تو تندرست عورت تھی۔ اچانک اُسے کیا ہوگیا ہے؟"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے دل میں ارشد کے خلاف بے شمار نفرت بھری پڑی ہے۔" میں نے کہا "تم کوئی ثبوت بھی دے سکتی ہو؟"

"نفرت؟" اُس نے ایک بار پھر دانت پیسے اور ہاتھ لمبا کرکے میری کلائی پکڑلی۔ اُس نے کہا ــــ "میرے دل میں انتقام نے اتنی آگ لگا دی ہے کہ میں عورت نہ ہوتی تو ایک ہاتھ میں اس کی گردن جکڑ کر اُسے مار دیتی"ــــ اُس نے اتنی زور سے میری کلائی اپنی انگلیوں میں جکڑلی کہ اُس کی انگوٹھی کے دباؤ سے میری کلائی کی ہڈی درد کرنے لگی۔

اُس نے میرا کام آسان کردیا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کے دل میں جو کچھ ہے وہ سنادے۔ پھر میں نے اُس سے کچھ سوال پوچھے۔ کچھ اُس نے تفصیلی جواب دیئے اور جب میں نے اپنے مخصوص مشفقانہ اور دوستانہ انداز کا مظاہرہ کیا تو اُس نے راز کی وہ بات بھی کہہ دی جو عورت کم ہی زبان پر لایا کرتی ہے۔ اُس نے مجھے ذرہ بھر ایسا تاثر نہ دیا کہ وہ گرفتاری سے خوفزدہ ہے اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کررہی ہے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کے اندر غبار بھرا ہوا ہے جو وہ نکالنا چاہتی ہے۔ میں کوئی ایسا

اناڑی تو نہ تھا کہ اُس کی باتوں کے جادو میں آجاتا یا اسے دُکھی عورت اور خوبصورت عورت سمجھ کر اپنے فرائض سے غافل ہوجاتا۔ میں تو انسان کا سایہ دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ یہ کس چال چلن کے آدمی کا سایہ ہے۔

اُس کے بیان کرمیں اُسی کے الفاظ میں ذرا اختصار سے پیش کردیتا ہوں۔ اس میں ہندو لڑکی کا ذکر کم کروں گا کیونکہ اُس نے اس لڑکی کے متعلق وہی باتیں بتائیں جو میں پہلے آپ کو سُنا چکا ہوں۔

اُس نے کہا ــــ "مجھے اپنے خاوند سے اور خاوند کو مجھ سے محبت تھی۔ یہ صرف میاں بیوی کی چاہت نہیں، صحیح معنوں میں محبت تھی۔ میرے دو بچے پیدا ہوئے۔ ہم دور دور کی چھاؤنیوں میں رہے۔ وہ بڑی ہی منحوس گھڑی تھی جب میرے خاوند نے اس چھاؤنی میں تبادلے کی کوشش شروع کی۔ میں بھی خوش تھی کہ اپنے شہر میں رہیں گے۔ خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تبادلہ ہوگیا۔ یہاں بنگلہ بھی جلدی مل گیا مگر سب سے بڑا ظلم یہ ہوا کہ میرے خاوند کو ایم۔ ای۔ ایس میں بھیج دیا گیا۔ جب گھر میں حلال کی تنخواہ آتی تھی تو برکت، سکون اور خوشی تھی۔ ایم۔ ای۔ ایس کی حرام کی دولت آنے لگی تو گھر میں اُلّو بول گئے۔ گھر میں شراب بھی آئی۔ بدکار عورت بھی آئی۔ خاوند نے مجھے بھی بے حیائی کی راہ پر

ڈالنے کی کوشش کی۔ کرنل جانسن جیسا کافر بھی آیا جس نے مجھے بدکاری پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ ہندو فاحشہ میری میری خوشیاں اور میرا سہاگ چھین لے گئی۔ میں نے اپنے گھر اُسے ننگا دیکھا اور کرنل جانسن کے ساتھ اور اپنے خاوند کو لڑکی کے ساتھ کتوں کی حالت میں دیکھا۔ میں نے خاوند کے پاؤں بھی پکڑے۔ بہت روئی۔ محبت کی قسمیں دیں۔ بچوں کے واسطے دیئے مگر شراب، رشوت اور عورت نے اُسے اندھا کر

"ان حالات نے مجھے بھی اندھا کر دیا لیکن میری نیت بُری نہیں تھی۔ میں نے اپنے خاوند کو جھٹکا دینے کے لیے ایک بنائی۔ اس کے لیے میں نے ارشد کو منتخب کیا۔ ارشد اتنا آدمی نہیں تھا جتنا بُرا بعد میں ثابت ہوا۔ برادری میں ہر اسے پسند کرتا ہے۔ کسی گھر میں چلا جائے گھر کی جوان لڑکیاں بھی اس سے حجاب نہیں کرتیں۔ بوڑھیاں اُسے بیٹا سمجھتی ہیں کسی بھی گھر کے مرد اس کا گھر میں آنا جانا ناپسند نہیں کرتے۔ وہ زندہ دل انسان ہے۔ اس کے خلاف کسی کو کوئی شکایت نہیں حالانکہ سب جانتے ہیں کہ وہ رنڈیوں کا گانا سننے جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ وہ شراب پیتا ہے لیکن ایسا کوئی نہیں ملتا جو یہ کہے اُس نے اسے شراب پیتے دیکھا ہے۔ برادری کے دائرے میں ایک نیک پاک انسان ہے۔ باہر جا کر وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی

پرواہ نہیں کرتا۔ سب اس کے احسان مند ہیں لیکن اس میں یہ نقص ہے کہ بڑ ہانکتا ہے اور غیر ضروری حد تک دلیر ہے....

میں ہنس پڑی ـــ وہ جذباتی ہو گیا

"میرے میکے گھر میں اُس کا بہت آنا جانا تھا۔ بدقسمتی سے میں بھی زندہ دل تھی۔ طبیعت ہنسنے کھیلنے کی طرف آمادہ رہتی تھی۔ میری ازدواجی زندگی دوسروں کے لیے قابلِ رشک تھی۔ کوئی فکر فاقہ نہ تھا۔ اس سے میری زندہ دلی قائم رہی، بلکہ بڑھ گئی۔ جب خاوند میرے ہاتھ سے نکل گیا اور ہندو لڑکی کے جال سے اس کا نکلنا محال ہو گیا تو میں نے ایک روز ارشد کو اپنے یہ سارے حالات بتائے۔ اُس نے پہلی بات یہ کہی ـــ "کہو تو اُس کا سر کاٹ کر تمہارے قدموں میں رکھ دوں" ـــ ہم میں بہنوں بھائیوں والی بے تکلفی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ میرا خاوند ایسا بُرا اور بدنیت آدمی نہیں۔ وہ اب بھی مجھے چاہتا ہے لیکن جس جال میں وہ پھنس گیا ہے اس میں سے نکالنے کے لیے ایک جھٹکے کی ضرورت ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ تم میرے بنگلے میں آنا شروع کر دو اور ہم اس طرح کی ایکٹنگ کریں گے جیسے ہم نے آپس میں ناجائز بے تکلفی پیدا کر لی ہے۔ ارشد میں ایک

نقص یہ بھی ہے کہ سکھوں کی طرح سوچتا کم ہے۔ جو کرنا چاہے کر گزرتا ہے۔ اگر ضرورت پڑے تو سوچتا بعد میں ہے۔ وہ نتائج کی پروا نہیں کیا کرتا۔ اگر میں بے عقل ہو گئی تھی تو اسے عقل سے کام لینا چاہیئے تھا۔ میرے جذبات ایسی بُری طرح مچلے گئے تھے کہ میری تو عقل ہی ماری گئی تھی۔ اُس نے میری سکیم سنی تو جھوم کر بولا ــــ ’لو۔ کل ہی لو‘ ــــ اُس روز میں ماں باپ کے پاس آئی ہوئی تھی۔ دوسرے دن بنگلے میں چلی گئی۔ اُسی شام ارشد آ گیا....

”میرا خاوند گھر تھا۔ اُسے ارشد نے رسمی سا سلام کیا اور میرے پاس آ گیا۔ اس کے بعد وہ دوسرے تیسرے دن آ جاتا اور میرے پاس بیٹھا رہتا۔ بعض اوقات میں اُسے کہتی کہ وہ پانچ چھ دن نہ آئے۔ وہ اتنے دن نہ آتا تو میں خاوند سے کہتی کہ میں ذرا گھر جا رہی ہوں۔ اُسے یہ شک ہو جاتا کہ ارشد اتنے دن سے نہیں آیا اس لیے میں اُسے ملنے جا رہی ہوں۔ پھر میں ارشد کے ساتھ پکچر دیکھنے بھی گئی اور ایک بار میرا خاوند باہر سے آ رہا تھا تو میں اُس کے قدموں کی آواز سن کر ارشد کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ خاوند کمرے میں آیا تو میں چہرے پر بناوٹی گھبراہٹ پیدا کر کے پرے ہو گئی۔ خاوند کا رنگ بدل گیا۔ وہ سمجھا کہ اس نے ہمیں موقعہ پر پکڑ لیا ہے۔ اُس رات میری اور خاوند کی بہت تُو تُو مَیں مَیں ہوئی۔ اُس نے کہا کہ ارشد سے تعلق توڑ لو۔ میں نے اُسے کہا کہ تم اس ہندو لڑکی سے تعلق توڑ لو۔ میں پہلے آپ کو تفصیل سے بتا چکی ہوں۔ میرے سر پر قرآن رکھ دو، میں کہوں گی کہ ارشد کے اور میرے تعلقات بہن بھائیوں جیسے تھے۔ خاوند نے مجھے اسی طرح محبّت کے واسطے دیئے جس طرح میں نے اُسے دیئے تھے مگر میں حیران ہوں کہ وہ اتنی محبت کے باوجود میری بات کیوں نہیں مانتا تھا اور ہندو لڑکی سے تعلق کیوں نہیں توڑتا تھا....

”آخر ایک روز ہم میں اتنی زیادہ لڑائی ہوئی کہ میں میکے آ گئی۔ سات آٹھ دنوں بعد خاوند آیا۔ اُس نے بہت منت کی کہ واپس چلو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن میں نہ گئی۔ میں اسے بہت پریشان کرنا چاہتی تھی۔ ارشد میرے پاس آتا رہا۔ میں اس کے گھر جاتی رہی۔ اُس کی بیوی بدھو سی لڑکی ہے۔ اس میں ذرّہ بھر پھُرتی اور چالاکی نہیں۔ ارشد نے اس کے متعلق کبھی بات نہیں کی تھی۔ اب اُس نے بیوی کے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ اس سے بیزار رہنے لگا۔ میں اُسے اس رویّے سے منع کرتی تھی....

”ایک روز ارشد نے کہا ــــ ’مجھے خدا سے یہ شکایت ہے کہ اس نے تمہیں میری بیوی کیوں نہیں بنایا‘ ــــ میں اپنی عادت کے مطابق ہنس پڑی۔ وہ اس قسم کا مذاق تو کیا ہی کرتا تھا، مگر

اس روز کے بعد وہ اسی قسم کی باتیں کرنے لگا۔ اس کا لب و لہجہ اور انداز بدلنے لگا۔ ایک روز میں اُس کے گھر گئی۔ اُس کی بیوی غسل خانے میں تھی۔ ارشد کو میں نے پہلی بار جذباتی کیفیت میں دیکھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر جذباتی لہجے میں کہا — 'اتنے دن انتظار نہ کرایا کرو' — اُس نے میرے دوپٹے کا پلّو ہاتھ میں لیا۔ اسے چُوما اور دوپٹہ اپنے منہ پر پھیر کر پلّو سلیقے سے میرے کندھے پر ڈال دیا۔ میں فیصلہ نہ کر سکی کہ اس کی اس حرکت کو پسند کروں یا اسے کہوں کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرے....

"پھر اُس پر میری محبت کا جنون سوار ہو گیا۔ اُدھر برادری میں ہم دونوں پر تہمتیں لگنے لگیں۔ سب سے پہلے مجھے ماں نے بتایا کہ لوگ ہمارے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے اُسے یقین دلایا کہ یہ سب بکواس ہے۔ میں نے ارشد سے کہا کہ اب ہمارا زیادہ ملنا ٹھیک نہیں، برادری میں بکواس ہو رہی ہے مگر اس کی شگفتہ شخصیت کے زیرِ اثر میں نے اُس کی یہ بات تسلیم کر لی کہ بکواس کرنے والے پھر بھی کریں گے۔ مجھے پتہ چلا کہ ارشد نے اپنی بیوی کو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ وہ اُس سے طلاق لے لے۔ یہ بات مجھے اُس کی بیوی نے بتائی تھی۔ میں نے ارشد کو خوب لتاڑا....

"میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے بیتابی سے مجھے اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا اور رندھی ہوئی آواز میں بولا۔

اگر تم اس عورت کو میرے گھر میں دیکھنا چاہتی ہو تو زہر کھاؤ اور مر جاؤ۔ جب تک تم زندہ ہو میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔'

میں اسے دھتکارنا نہیں چاہتی تھی۔ اُسے ہوش میں آنے کو کہا مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو چکا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ تم سے ملنا چھوڑ دوں گی۔ اُس نے کہا — 'یہ بھی کر کے دیکھ لو۔ نہ تمہارے لیے اچھا ہوگا، نہ میرے لیے نہ میری بیوی کے لیے'....

"میں اس سے ڈرنے لگی۔ سچی بات یہ بھی ہے کہ میں اُسے اس حال میں چھوڑ بھی نہیں سکتی تھی۔ اُس نے محبت کے جذباتی اظہار کے سوا کوئی اور حرکت نہیں کی تھی جسے آپ نازیبا یا فحش کہہ سکیں۔ لیکن میں اسے بھی بے جا سمجھتی تھی۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تو میرے خلاف یہ تہمت بھی ثابت ہو جائے گی کہ میں نے ارشد کو طلاق دینے پر مجبور کیا ہے۔ یہ وجہ بھی تھی کہ میں نے ارشد سے تعلق توڑنا مناسب سمجھا....

"دن گزرتے گئے اور ارشد بہت تیزی سے جذباتی ہوتا گیا۔ میں اسے تین چار روز نہ ملتی تو اس کا نوکر (کوچوان) کسی کام کے بہانے میرے گھر آتا اور اشارہ کر جاتا کہ ارشد بلا رہا ہے۔ میں نے اپنے والدین کو یہ دھوکہ دینا شروع کر دیا کہ جھوٹ بول کر گھر سے نکلتی اور ارشد کے گھر چلی جاتی۔ اس کی وہ زندہ دلی

ختم ہو چکی تھی جو مجھے اچھی لگا کرتی تھی۔ مجھے کہتا تھا کہ میرے سامنے بیٹھی رہو۔ میں اُس کی بیوی کی موجودگی میں اس کے پاس الگ بیٹھنا پسند نہیں کرتی تھی مگر ارشد نے اپنی بیوی کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ میں اُس کے کمرے سے اُٹھ کر اُس کی بیوی کے پاس جانے لگتی تو وہ مجھے پکڑ کر اپنے سامنے بٹھا لیتا....

" ایک روز پتہ چلا کہ اُس نے اپنی بیوی کو گھر بھیج دیا ہے۔ اُس کی بیوی نے ہم دونوں کو بہت ہی بدنام کر دیا تھا۔ وہ ہر جگہ کہتی پھرتی تھی کہ میں نے اُس سے اُس کا خاوند چھین لیا ہے۔ میں نے جب سنا کہ اُس نے اپنی بیوی کو گھر بھیج دیا ہے اور یہ بھی کہ اب وہ اسے واپس نہیں لائے گا تو میں اُس کے گھر چلی گئی۔ اس روز تو میں اس کے آگے رو پڑی اور کہا کہ اپنی بیوی کو گھر بھیج کر اُسے کچھ حاصل نہ ہوگا سوائے بدنامی کے، مگر وہ تو جیسے اپنے آپ میں رہا ہی نہیں تھا۔ پہلے مجھے اپنے سامنے بٹھاتا تھا، اب اپنے پاس بٹھا لیتا اور میرے ساتھ اس طرح کھیلنے لگتا جیسے بچّہ ماں کے ساتھ کھیلتا ہے....

" میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب اسے نہیں ملوں گی۔ یہ قطع تعلّق کا فیصلہ تھا جس پر میں دو دن سے زیادہ عمل نہ کر سکی۔ اس کا کوچوان مجھے بلانے آیا تو میں نے یہ کہہ کر جانے سے انکار کر دیا کہ پہلے اپنی بیوی کو گھر لاؤ پھر آؤں گی۔ میں برادری میں بہت بدنام ہو چکی ہوں۔ اس

نے مجھے جواب بھیجا کہ اگر میرے ساتھ دوستی ترک کرو گی تو میں یہ مشہور کر دوں گا کہ تمہارے ساتھ میرے تعلّقات ناجائز ہیں، اسی لیے میری بیوی اپنے گھر چلی گئی ہے۔ اُس نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ میں تمہارے خاوند تک کو یقین دلا دُوں گا کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے اُس سے طلاق لینا چاہتی ہو....

میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا

" مرد صبح و شام جھک مارتا ہے اُس پر کسی کی انگلی نہیں اٹھتی۔ عورت کو صرف شک پر فاحشہ اور بدکار کہہ دیا جاتا ہے۔ میں عورت تھی۔ ارشد کو جانتی تھی۔ وہ جو کہتا تھا وہ کر گزرتا تھا۔ وہ بلیک میلنگ پر اُتر آیا تھا۔ کچھ ڈر تھا اور کچھ غصّہ کہ میں اُس کے گھر چلی گئی۔ اُس نے مجھے کوئی طعنہ نہ دیا، نہ ایسی خوشی کا اظہار کیا کہ اُس نے مجھے بدنام کرنے کی دھمکی دے کر بلا لیا ہے۔ اُس روز وہ بہت جذباتی تھا۔ نازیبا حرکتیں بھی کرنے لگا۔ میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ اُس نے مجھ پر ایسا اثر ڈال دیا تھا کہ میں اُس سے آزاد ہونے کی ہمت نہیں کر سکتی تھی....

" میں نے اُسے ایسی حرکتوں سے روکا تو اُس نے دست درازی ترک کر دی۔ اس کی بجائے نہایت تحمّل سے اس نے مجھے یہ دھمکی

دی کہ میری عزت اور بدنامی اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اُس کے ساتھ ہی وہ محبت کا اظہار بھی کرتا رہا۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ محبت کا مجھے فریب نہیں دے رہا تھا، مگر وہ بلیک میلنگ کا ذلیل حربہ استعمال کرنے کی ٹھان چکا تھا۔ میں اُس کے سامنے کمزور پڑتی گئی آخر میں نے اُس کی منتیں شروع کر دیں کہ وہ مجھے آزاد کر دے اور بدنامی سے بچائے۔ ہمارے درمیان بہت باتیں ہوئیں۔ آخر اُس نے مجھ سے ایسی قیمت مانگی جس کے تصور سے ہی میں کانپ گئی لیکن میں آپ کو سمجھا نہیں سکتی کہ اُس نے مجھے ایسی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا کہ میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا....

"پھر میری جو حالت ہوئی میں وہ بھی بیان نہیں کر سکتی۔ میں نے ایک فیصلہ تو یہ کیا کہ ابھی اپنے خاوند کے پاس چلی جاؤں اور اسے بتاؤں کہ وہ تو ذلیل ہوا ہی تھا اُس نے مجھے بھی ذلیل کرا دیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری مجھ پر بھی عائد ہوتی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ چلو قیمت تو بڑی شرمناک ادا کی ہے لیکن اِس عجیب و غریب دوستی سے ہمیشہ کے لیے نجات ملی، مگر یہ میری خوش فہمی تھی۔ ارشد سے رخصت ہونے لگی تو وہ میرے آگے کھڑا ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ آپ یقین کریں کہ وہ ارشد جو کسی انسان کے آگے کیا سر جھکائے گا خدا کے آگے بھی سر نہیں جھکاتا، میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ

گیا اور میرے پاؤں پکڑ کر سر میرے پاؤں پر رکھ دیا۔ میں اُسے اٹھاتی تو وہ سر اُٹھاتا ہی نہیں تھا۔ میں پیچھے ہٹی تو اُس نے میرے ٹخنے مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ میں اُس کے سامنے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اُس نے سر اٹھایا اور مجھ سے معافی مانگنے لگا۔ میں بھی جذباتی ہو گئی۔ میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے اُسے کہا کہ تم نے مجھے بہن کہہ کر ناپاک کیا ہے۔ میں تمہیں بخش دوں گی، خدا تمہیں نہیں بخشے گا....

"اُس نے مجھے بٹھا لیا اور عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔ "پھر تمہیں طلاق دے دے تو میرے ساتھ شادی کر لو گی؟"
میں نے اس سے رخصت ہونے کے لیے کہہ دیا کہ میں طلاق لوں گی ہی نہیں، اگر طلاق ہو بھی گئی تو تم اپنی بیوی کا کیا کرو گے؟
اُس نے کہا۔ "میں اُس سے جان چھڑا لوں گا"۔ میں نے جواب دیا۔ "پھر مجھے اپنا سمجھو"۔ میں بڑی ہی روح کش پریشانی میں وہاں سے نکلی....

"تیسرے روز کا واقعہ ہے کہ صبح سویرے سویرے میرے خاوند کا اردلی سخت گھبراہٹ میں میرے گھر آیا اور یہ خبر سنائی کہ میجر صاحب قتل ہو گئے ہیں۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ بنگلے میں پولیس کا پہرہ ہے اور لاش ہسپتال لے گئے ہیں۔ میں کس طرح ہسپتال پہنچی؛ مجھے یاد نہیں رہا۔ میرے ہوش گم ہو گئے تھے۔ میرے بچوں کا باپ جسے میں نے دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا، مارا گیا تھا۔ لاش کا

پوسٹ مارٹم ہو رہا تھا۔ میں اُس کمرے کی طرف دوڑتی تھی جہاں ظالم میرے سہاگ کو چیر پھاڑ رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ کون جو مجھے پکڑ پکڑ کر پیچھے کو گھسیٹ رہے تھے....

"پھر میں نے اپنے میجر کی لاش دیکھی۔ لاش گھر آئی۔ گھر چلی بھی گئی اور میرے سہاگ کی بات ختم ہو گئی۔ میرا دل گواہی دیتا کہ قاتل ارشد ہے مگر میں نے ہونٹ سی لیے تھے۔ ڈرتی تھی کہ ا کا نام لیا تو وہ کہہ دے گا کہ اپنے خاوند کو میں نے قتل کرایا ہے معلوم نہیں کتنے دن گزرے، ارشد کا نوکر آیا۔ اس نے مجھے اشا کیا۔ میں فوراً ارشد کے گھر چلی گئی۔ اُسے جاتے ہی کہا — 'تم نے قتل کیا ہے' — وہ قسمیں کھانے لگا اور بولا 'تم مجھ پر الزا عائد کر رہی ہو؟ اور میں قاتل کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ اگر اُسے پولیہ نے گرفتار کر لیا تو اُسے پولیس سے چھین کر تمہارے گھر لے آؤں اور تمہارے دروازے پر اُس کی شہ رگ پر چھری پھیر دوں گا میں تمہارے خاوند کے خون کا بدلہ ایک درجن آدمی قتل کر کے لوں گا'....

"مجھے اس پر اعتبار آ گیا۔ اُس نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا او پھر اُس نے نہایت اچھے طریقے سے مجھے میرا وعدہ یاد دلایا۔ میں نے اُسے کہا کہ اپنی بیوی کو گھر لے آئے۔ تم اُسے طلاق نہیں دے سکتے۔ اُسے گھر میں بسا لو....

"میں اپنے گھر چلی گئی۔ پھر سنا کہ ارشد اور بیوی کا سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ میرے ابا جان بھی اس میں شامل تھے اور پھر معلوم ہوا کہ ارشد اپنی بیوی کو گھر لے آیا ہے۔ اس کے بعد یہ خبر سنی کہ اُس کی بیوی اچانک بیمار ہو گئی ہے۔ پھر یہ کہ اُسے ہسپتال لے گئے ہیں۔ برادری کی عورتیں اُسے دیکھنے گئی تھیں۔ میری امی بھی گئی تھیں۔ انہوں نے جو حالت آج بتائی ہے اس سے مجھے شک ہو گیا ہے کہ اسے ارشد نے کچھ کھلا دیا ہے۔ پرسوں یہ اطلاع ملی کہ ارشد اور اس کا نوکر (کوجوان) حوالات میں بند ہیں اور اُن پر الزام میرے خاوند کے قتل کا ہے تو میں نے اپنی امی سے کہا — 'یہ جھوٹ نہیں۔ میرے خاوند کا قاتل ارشد ہے' — امی نے مجھے سختی سے ڈانٹا کہ برادری کا معاملہ ہے، میں چپ رہوں۔ میں چپ ہو گئی لیکن دل جلنے لگا۔ میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ دل میں کئی بار آئی کہ کسی کو بتائے بغیر پولیس سٹیشن چلی جاؤں اور کہوں کہ قاتل یہی ہے۔ ابا جان نے جب مجھے بتایا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو میں فوراً تیار ہو گئی مگر آپ کے سامنے آئی تو میں گھبرا گئی۔ اللہ آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا کہ آپ نے مجھے بہن کہا اور تھانیداروں کی طرح بات کرنے کی بجائے بھائیوں کی طرح بات کی۔"

میرے ایمان کی قیمت تیس ہزار روپے ہوگئی

میں نے اُس کا بیان بہت مختصر کر کے آپ کو سنایا ہے
اس کے درمیان میں اس سے سوال پوچھتا رہا۔ بعد میں کوئ
گھنٹے جرح کی اور میں نے یہ رائے قائم کی کہ اس نے جو کچھ ک
ہے وہ جھوٹ نہیں ہے۔ اُس نے یہ تو کئی بار کہا تھا ۔۔۔ "
ارشد کی لاش دیکھنا چاہتی ہوں"۔۔۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ و
میجر کے قتل میں پکڑا ہوا ہے اور اُس نے اپنی بیوی کو بھی ز
دیا ہے۔ وہ شاید کل تک ختم ہو جائے گی۔ پھر میں نے اسے کہ
اگر وہ ارشد کی لاش دیکھنا چاہتی ہے تو اُسے گواہ بن کر عدال
میں جانا پڑے گا۔

وہ جھجک گئی۔ کہنے لگی کہ میں یہ سارا بیان بھری کچہری میں
نہیں دے سکوں گی۔ میں اُس کا مطلب سمجھ گیا اور اسے کہا کہ بیان
وہ حصہ گواہی میں غیر ضروری ہے۔ مختصر یہ کہ میں نے اُسے گوا
کے لیے تیار کر لیا اور اُسے کہا کہ میں اُسے وہ بیان اچھی طرح یا
کرا دوں گا جو اُسے عدالت میں دینا ہو گا۔ اس کے باپ کو ک
میں بلا کر بتایا کہ میجر کا قاتل ارشد ہے اور آپ کی بیٹی کو شہاد
کے لیے عدالت میں آنا پڑے گا۔

میں تھانے پہنچا تو رات کے سوا بارہ بج چکے تھے۔ صبح ساڑھے
آٹھ بجے سول ہسپتال سے فون آیا۔ ڈاکٹر نے اطلاع دی کہ ارشد
کی بیوی مر گئی ہے۔ اُس کے پیٹ سے نکلا ہوا کچھ مواد اور خون
پہلے ہی مطلوبہ رپورٹ کے لیے بھیج دیا گیا تھا۔ میں نے ڈاکٹر سے
کہا کہ لاش کسی کو نہ دے۔ میں فوراً ہسپتال گیا۔ لاش قبضے
میں لے لی۔ پوسٹمارٹم کا بندوبست کرایا۔ دیگر کاغذی کارروائی
کی اور جب شام کو پوسٹمارٹم رپورٹ دیکھی تو سارے شکوک
رفع ہو گئے۔ مرنے والی کو زہر دیا گیا تھا۔

میں نے ارشد کو حوالات سے نکلوایا اور اُسے دفتر میں
بٹھا لیا۔ اتفاق سے اُس نے واردات کے وقت والے شوز
پہن رکھے تھے۔ میں نے اُسے اُس کے شوز کے کھرے کا مولڈ دکھایا اور اُس
کے دائیں جوتے کی گھسی ہوئی ایڑی دکھائی۔ اس پر کچھ اثر
نہ ہوا۔ میں نے اُسے کہا کہ اب اگر وہ لاؤڈ سپیکر سے اعلان کرتا
پھرے کہ وہ بے گناہ ہے تو اُس کی کوئی نہیں سُنے گا۔ اُس نے
جواب دیا۔ "مجھے اپنے گناہ کا علم ہی نہیں"۔۔۔ میں نے اسے کہا
۔۔۔ "اگر تم اقبالِ جرم کر کے آلۂ قتل کی خود ہی نشاندہی کر دو تو
میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں گا"۔

"میں نے کوئی جرم ہی نہیں کیا"۔۔۔ اُس نے نڈر ہو کر بے پرواہی
سے کہا۔۔۔ "اقبال کیسا کروں؟"

"تمہاری مرضی" میں نے کہا "کہو تو تمہاری دونوں وارداتوں کی پوری کہانی سنا دوں۔ تمہارا کوچوان سلطانی گواہ بن چکا ہے۔ شہادت مکمل ہے۔ مجھے تمہارے اقبالی بیان کی ضرورت ہی نہیں"

"سنو ملک!" اُس نے کہا "تم اوپر نیچے کا زور لگا لو میں جرم قبول نہیں کروں گا۔ سیدھی بات کرو، کیا لیتے ہو۔ تم نے اتنی رقم خواب میں بھی نہیں دیکھی ہو گی جو تمہیں میں دوں گا کیس پر مٹی ڈالو۔ منہ سے بولو کتنا لو گے۔ کہو تو آدھا مربع زرعی اراضی تمہارے نام رجسٹری کرا دوں گا۔ نقد الگ دوں گا۔"

"اگر تم پھانسی سے بچ گئے تو بات کروں گا" میں نے کہا۔

"پھر لگا لو زور" اُس نے کہا۔ میں نے رائے قائم کی کہ یہ شخص اُس سے زیادہ دلیر ہے جتنا میں نے سنا تھا۔

میں نے تانگہ منگوایا۔ دو کانسٹیبلوں اور ہیڈ کانسٹیبل کو ساتھ لیا۔ ارشد کو تانگے میں بٹھایا اور اُس کے گھر گئے۔ رگھبیر سنگھ نے پہرے کا بڑا اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ میں نے دو مشیر بلائے اور ارشد کے گھر کی تلاشی لی۔ کوچوان نے مجھے بتا دیا کہ وہ چاقو کہاں رکھا تھا۔ کوچوان نے چاقو دھو تو دیا تھا لیکن میں نے اسے دھوپ میں لے جا کر دیکھا تو مجھے شک ہوا جیسے اُس اندرونی جگہ جہاں بلیڈ دستے کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے خشک خون موجود ہے۔

میں نے جیب سے وہ تین چابیاں نکالیں جو مقتول کے بنگلے

کی فصیل کے باہر ایک چھلے میں ملی تھیں۔ ارشد کو چابیاں دکھا کر پوچھا "یہ تمہاری چابیاں ہیں؟ کون کون سے تالے کی ہیں؟" اُس نے چابیوں کی ملکیت سے انکار کر دیا۔ میں نے چابیاں ٹرنکوں اور اٹیچی کیسوں کے تالوں کو لگائیں۔ دو لگ گئیں۔ تیسری کسی بڑے تالے کی تھی جو ارشد نے توڑ لیا ہو گا۔ اُس نے بتایا نہیں کہ وہ تالہ کہاں ہے۔

دو انسانوں کا قاتل خاموش تھا۔ کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ مجھے طنزیہ نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اُس پر ابھی تک جاگیر اور دولت کا نشہ سوار تھا۔ میں نے اس کا نشہ اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ خانہ تلاشی کی کاغذی کارروائی مکمل کر کے اُسے تھانے میں لے گیا۔ اُس کے باپ نے مجھے الگ لے جا کر پچیس ہزار نقد کی پیش کش کی۔ تھانے پہنچتے پہنچتے میرے ایمان کی بولی تیس ہزار روپے ہو گئی۔ چاقو کا پارسل بنا کر ایگزامنر کو بھجوا دیا۔ میں نے ارشد کا مزید ریمانڈ نہیں لیا۔ اُسے جیل کی حوالات میں بھجوا دیا۔

چھ ماہ بعد جیل سے اُس کی لاش نکلی جو مقتول کی بیوی نے ضرور دیکھی ہو گی۔ اُس نے گواہی بڑی ہی خود اعتمادی سے دی تھی۔ صفائی کا وکیل دلی کا چوٹی کا بیرسٹر تھا مگر وہ ارشد کو دوہرے قتل کے جرم میں سزائے موت سے بچا نہ سکا۔

منگنی کی انگوٹھی

میں نے سٹیشن ماسٹر اور دو گواہوں کی موجودگی میں ٹرنک کا تالا توڑا۔ ڈھکنا اُٹھایا تو تماشائی یوں پیچھے کو بھاگے جیسے اندر سے جن نکل آیا ہو۔ ٹرنک میں ایک جوان آدمی کی لاش پڑی تھی۔ ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ لاش کے کپڑے خون سے لال تھے۔ مقتول کی عمر بائیس تئیس سال تھی۔

ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک ہی قبیلہ ایک ہی تحصیل کے مختلف دیہات میں آباد تھا۔ میں اس قبیلے کا نام اور ذات نہیں لکھوں گا۔ ان کی نشاندہی نہیں کروں گا، کیونکہ اس قبیلے کے سینکڑوں گھرانے ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرکے پاکستان میں آباد ہو چکے ہیں۔ یہ کہانی ان لوگوں کی توہین کا باعث بن سکتی ہے۔ ہندوستان میں یہ قبیلہ خونخواری اور غیرت مندی کی وجہ سے مشہور تھا۔ عورت کے معاملے میں یہ لوگ بڑے ہی حساس اور سخت تھے۔ انگریز کے قانون کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ضرورت پڑے تو قانون اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ پکے مسلمان اور اونچے کردار کے لوگ تھے۔ ان کے ہاں چوری چھپے عشق و محبت کا کھیل کھیلا جاتا تھا اور بدی بھی موجود تھی۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا تو یہ واحد قبیلہ تھا جس کے علاقوں میں ہندوستانی فوج اور پولیس کو بھی حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی

ہندوؤں پر اس قبیلے کا خوف طاری رہتا تھا۔ اُن کے ہتھیاروں میں تلوار اور برچھی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔

اس قبیلے کے گھرانوں نے بڑی دلیری سے وہاں سے ہجرت کی اور جس قافلے کے ساتھ وہ آئے اس کا بچہ بچہ محفوظ پاکستان میں داخل ہُوا۔ پاکستان میں نو آبادکاری نے ان لوگوں کا دم خم توڑ دیا۔ قبیلہ بکھر گیا۔ زیادہ تر نے اپنا پرانا پیشہ، کاشتکاری اختیار کیا۔ بعض فوج میں بھرتی ہو گئے اور بعض شہروں میں آباد ہو کر تعلیم یافتہ ہو گئے۔ اس قبیلے میں اب ہندوستان والی خونخواری نہیں رہی۔ یہاں کے مسائل اور تہذیب نے ان لوگوں کو بدل ڈالا ہے۔

میں جس قصبے کے تھانے میں ایس۔ ایچ۔ او تھا اس کے ریلوے سٹیشن پر پسنجر ٹرین رُکی۔ اُس زمانے میں ریل گاڑیوں میں رش نہیں ہوتا تھا۔ ایک ڈبے سے تین ہندو ڈُوم اُترے (ڈُوم ہندوؤں کی ایک کمین ذات ہے۔ مُردے جلانے کا کام ڈُوم ہی کرتے ہیں) ان تین ڈوموں کے پاس بہت سا سامان تھا۔ اس میں ایک کالا ٹرنک بھی تھا۔ ٹکٹ کلکٹر نے سامان زیادہ دیکھ کر انہیں روک لیا۔ کالا ٹرنک بڑے سائز کا تھا اور جس نے اُٹھا رکھا تھا اُس سے چلا نہیں جاتا تھا۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ایک تھرڈ کلاس ٹکٹ کے ساتھ صرف پچیس سیر سامان لے جایا جا سکتا ہے۔ ٹکٹ کلکٹر نے سامان رکھوا کر دیکھا تو اُسے بدبو سی محسوس ہوئی۔ ٹرنک بہت پرانا تھا۔ نیچے کے ایک کونے پر ایسے نظر آیا جیسے خون جما ہُوا ہو۔ تماشائی اکٹھے

ہو گئے۔ تین چار آدمیوں نے ٹرنک کو سونگھ کر کہا کہ اس کے اندر اگر انسان کی لاش نہیں تو کوئی مرا ہوا جانور ضرور ہے۔

ڈوموں سے کہا گیا کہ تالا کھولو۔ انہوں نے جواب دیا کہ چابی اُن کے پاس نہیں ہے۔ شک پکا ہو گیا۔ تھانے میں اطلاع آئی۔ میں نے جا کر ٹرنک دیکھا اور دو منٹ بعد میں نے فیصلہ دے دیا کہ اس میں لاش ہے۔ تینوں ڈوموں نے پہلے تو میرے آگے ہاتھ جوڑے پھر میرے پاؤں پکڑے اور آخر میں سر میرے پاؤں میں رکھ دیئے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ ٹرنک اُن کا نہیں۔ میں نے سٹیشن ماسٹر اور دو گواہوں کی موجودگی میں ٹرنک کا تالا توڑا۔ ڈھکنا اُٹھایا تو تماشائی یوں پیچھے کو بھاگے جیسے اندر سے جن نکل آیا ہو۔ ٹرنک میں ایک جوان آدمی کی لاش پڑی تھی۔ ٹانگیں پیٹ کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ لاش کے کپڑے خون سے لال تھے۔ مقتول کی عمر بائیس تئیس سال تھی۔ وہ دیہاتی تھا۔

ڈوموں نے ساٹھ میل دُور کے ایک قصبے کا نام لے کر بتایا کہ وہ اس سے دو سٹیشن پیچھے سے اس گاڑی میں آ رہے تھے۔ رات گاڑی اس قصبے کے سٹیشن پر رُکی تو ایک آدمی کھیس لپیٹے ہوئے پلیٹ فارم کی دوسری طرف سے ان کے ڈبے میں آیا۔ اُس نے پہلے ٹرنک دروازے میں رکھا۔ اسے دھکیل کر سیٹ کے نیچے کیا۔ وہ گاڑی سے اُتر گیا۔ گاڑی چل پڑی لیکن وہ نہیں آیا۔ ڈوموں کو اس سٹیشن پر اترنا تھا۔ انہوں نے چوری کے ارادے سے ٹرنک گاڑی سے اتار لیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ٹرنک کا مالک گاڑی سے رہ گیا ہے، ورنہ یہ پسنجر گاڑی جو کم از کم پچیس سٹیشنوں پر رُکی تھی، وہ کسی اور

ڈبے میں ہوتا تو ٹرنک والے ڈبے میں آ جاتا۔ میں اُن کے بیان کو بغیر کسی ثبوت کے صحیح تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ انہیں ٹرنک سے بدبو نہیں آئی تھی؟ ان میں سے ایک نے جواب دیا — "حضور، ہم لاشیں جلانے کے عادی ہیں۔ ایک لاش اور وہ بھی جلتی ہوئی، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتنی بدبو ہوتی ہو گی۔ یہ تازہ لاش ہے۔ اس کی ہمیں کیا بدبو آئے گی۔"

اس جواب سے مطمئن تو ہو گیا لیکن انہیں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ انہیں لاش غائب کرنے کی اُجرت ملی ہو۔ انہیں حراست میں لے لیا۔ ریل گاڑی دو تین منٹ رک کر جا چکی تھی۔ میں نے سٹیشن ماسٹر کے کمرے میں لاش ٹرنک سے باہر نکالی۔ زخم دیکھے۔ چار گہرے زخم تھے۔ ایک پیٹھ پر کمر میں۔ دو پیٹ کے بالائی حصے میں اور ایک بالکل دل کے مقام پر۔ میرے خیال میں یہ زخم برچھیوں کے تھے۔ لاش نے کُرتہ پہن رکھا تھا جس کے پہلو میں جیب تھی۔ میں نے جیب کی تلاشی لی۔ اس میں سے روپے کے دو سکے اور چند آنے برآمد ہوئے اور خدا نے میری یہ مدد کی کہ جیب میں سے ایک پوسٹ کارڈ بھی برآمد ہوا۔ یہ دوہرا کیا ہوا تھا۔ ایڈریس باہر کی طرف تھا مگر ایڈریس پر خون پھر گیا تھا۔ ایک بھی لفظ نہیں پڑھا جاتا تھا۔ پوسٹ کارڈ کو سیدھا کیا تو دوسری طرف اندر کو ہونے کی وجہ سے صاف تھی۔ خون وہاں تک گیا تھا لیکن کام کی تحریر صاف تھی۔ اوپر لکھا تھا — "از میرٹھ چھاؤنی" — آگے خیر خیریت اور عام سی باتیں لکھی تھیں۔ اور نیچے خط لکھنے والے کا نام اور پورا پتہ تھا — "حوالدار صادق علی۔ بی کمپنی۔ راجپوتانہ رائفلز۔ میرٹھ چھاؤنی"

پہلا سوال میرے دماغ میں یہ آیا کہ کیا یہ میرا کیس ہے یا اس تھا
کا جہاں سے ڈوموں کے بیان کے مطابق، ٹرنک گاڑی میں رکھا گیا تھ
اس تھانے کا جہاں سے ڈوم ریل گاڑی میں سوار ہوئے تھے؟ میں
ڈوموں کے ٹکٹ اپنے قبضے میں لے لیے تھے۔ بالائی حکام سے ہدای
لینے کی بجائے میں نے پولیس آفیسر کی حیثیت سے سوچا کہ وقت ضا
ہوگا، مجھے ابتدائی کارروائی کر لینی چاہیئے۔ کیس کسی بھی تھانے کا ہو ہ
پولیس کا کیس ہے اور قتل کا کیس ہے۔ قتل کی تفتیش میں ایک منٹ بھ
ضائع نہیں ہونا چاہیئے۔ میں نے حال ہی میں لاہور کے متعلق اس قسم کی خبریں پڑھی ہ
کہ ایک آدمی قتل ہوگیا تو دو تھانوں کے تھانیدار اس مسئلے میں اُلجھ گ
کہ یہ کیس کون سے تھانے کا ہے۔ اسی میں کئی گھنٹے ضائع ہو گئے اور ملز
شہر سے نکل گئے یا روپوش ہو گئے۔

میں نے بڑی دُور کے تھانے کے کیس کی ابتدائی کارروائی شروع کر دی ــــ بے شک تین ملزم میری حراست میں تھے لیکن انہوں نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ وہ بہت ہی غریب اور مرے مارے ہوئے لوگ تھے۔ انہوں نے ٹرنک کو لاوارث سمجھ کر اس لالچ سے اٹھا لیا تھا کہ اندر سے سامان برآمد ہوگا۔ ریل گاڑی سے اتری ہوئی ٹرنک میں بند لاش تھانیداروں کے لیے اکثر لاینحل معمہ ہوتا ہے۔ یہ تو بعد کی بات ہوتی ہے کہ قاتل کون ہے۔ پہلا سوال تو یہ ہوتا ہے کہ مقتول کون ہے اور کہاں قتل ہُوا ہے۔ ریل گاڑی کے ڈبے اور انجن تو گواہی دے نہیں سکتے....

ں نے وہیں کاغذات تیار کیے۔ سٹیشن ماسٹر، ٹکٹ کلکٹر اور ایک آدمی
ے دستخط لیے، ڈوموں کو ساتھ لیا اور تھانے گیا۔ لاش پوسٹ مارٹم کے
لیے بھیج دی اور خود میرٹھ جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ریل گاڑی کے سات آٹھ گھنٹے کے سفر نے مجھے میرٹھ پہنچا دیا۔ چھاؤنی
لیا اور راجپوتانہ رائفلز کی بارکیں ڈھونڈ لیں۔ رات ہو چکی تھی۔ میں نے
قت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسی وقت آفیسرز میس میں گیا۔ تمام
افسر انگریز ہُوا کرتے تھے۔ ان میں خوبی یہ تھی کہ پاکستانی افسروں کی طرح
ٹالتے نہیں تھے۔ میس میں جا کر کمانڈنگ آفیسر کے متعلق پوچھا تو مجھے اُس
ے بنگلے پر پہنچا دیا گیا۔ برآمدے میں صاحب بہادر کے کتے نے میرا پُرجوش
استقبال کیا۔ اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ صاحب خود ہی باہر آ گیا۔ میں نے
سیلوٹ کیا اور آنے کی وجہ بیان کی۔ وہ مجھے اندر لے گیا۔ میں نے اُسے
خون آلود پوسٹ کارڈ دکھا کر واردات سنائی اور بتایا کہ حوالدار صادق علی
سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُس سے یہ معلوم کرنا ہے کہ اُس نے یہ خط کسے لکھا
تھا اور یہ ایڈریس کیا ہے جو خون سے بجھ گیا ہے اور پھر اُسے ساتھ لے
جا کر لاش کی شناخت کرنی ہے۔

اس انگریز لیفٹیننٹ کرنل کو جب یہ پتہ چلا کہ میں بہت دُور سے آیا ہوں تو اُس نے میرے انکار کے باوجود خانساماں کو میرے لیے دیسی کھانا لانے کو کہا اور اردلی کو اُسی وقت بلا کر کہا کہ بی کمپنی کے حوالدار صادق علی کو بلا لائے۔ کھانا آنے تک کرنل میرے ساتھ قتل کی وارداتوں کے متعلق بڑی

دل چسپ باتیں کرتا رہا.... کھانے کے دوران حوالدار صادق علی آگیا۔ میں
نے اُس کے کمانڈنگ آفیسر کے سامنے اُسے پوسٹ کارڈ دکھایا تو میں نے دیکھا
کہ اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے فلاں ضلع اور تحصیل
کے فلاں گاؤں کے حسین نام کے ایک دوست کو یہ کارڈ ایک ہفتہ پہلے لکھا
تھا۔ اس نے مقتول کی عمر صحیح بتائی۔ مونچھوں کی بناوٹ اور چہرے کے
نقش و نگار بتائے وہ لاش سے ملتے جلتے تھے۔ میں نے کرنل سے کہا کہ
تفتیش کے لیے حوالدار کو ساتھ لے جانا ہے۔ اُس نے کہا کہ میں صبح دفتر
جاؤں اور کاغذی کارروائی کے بعد اسے اپنے ساتھ لے جاؤں۔

لاش کس کی تھی؟

میں نے رات چھاؤنی کے تھانیدار کے گھر گزاری۔ صبح راجپوتانہ
رائفلز کے دفتر گیا۔ حوالدار صادق علی کو سرکاری پاس پر میرے ساتھ روانہ
کردیا گیا.... ہم آٹھ گھنٹوں کے سفر کے بعد اپنے قصبے میں پہنچے تو رات
ہو چکی تھی۔ لاش تھانے میں آ چکی تھی۔ حوالدار صادق علی نے دیکھتے ہی
پہچان لی۔ اس نے روتے ہوئے کہا —— "یہ میرا جگری دوست حسین
ہے"۔ اس نے اس کے گاؤں کا نام لیا اور بتایا کہ یہاں سے تقریباً ساٹھ
میل دور ہے۔ ایک قصبے کے ریلوے سٹیشن پہ اترنا پڑتا ہے اور ڈیڑھ
میل پیدل یا یکے پہ گاؤں جانا پڑتا ہے۔ میں نے وقت دیکھا۔ رات کو ایک بجے

ٹرین گزرتی تھی۔ اس میں گھنٹہ بھر وقت تھا۔ میں نے لاش اٹھوائی
اور ریلوے سٹیشن گئے۔ میرے ساتھ تینوں ڈوم ہتھکڑیوں میں اور حوالدار
صادق علی بطور گواہ تھا۔ گاڑی آئی۔ لاش سامان کے ڈبے میں رکھوائی اور
ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں نے ابتدائی کارروائی
پوری کر دی ہے۔ کیس چونکہ دوسرے قصبے کا ہے اس لیے ابتدائی
کارروائی کے کاغذات، لاش، تین مشتبہ افراد اور ایک گواہ متعلقہ
تھانے کے حوالے کر کے فارغ ہو جاؤں گا۔ یہ کیس میرا نہیں تھا، پھر بھی
میں نے حوالدار صادق علی سے گاڑی میں باقاعدہ پوچھ گچھ شروع کر دی
کہ تھانے دار کی کچھ مدد ہو جائے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ یہ تھی کہ لاش کا جس وقت پوسٹ مارٹم شروع
ہوا موت اس سے اندازاً بارہ گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔ مقتول کی عمر
بائیس تیئیس سال تھی۔ چاروں زخم تین دھاری برچھی کے تھے۔ آپ نے
برچھی دیکھی ہوگی۔ اکثر کے پھل دو دھارے یعنی دونوں طرف سے تیز ہوتے
ہیں۔ بعض پھل تین دھارے اور چار دھارے بھی ہوتے ہیں۔ مقتول کو
تین دھارے پھل والی برچھی سے مارا گیا تھا۔ پیٹھ کا زخم گہرا تھا۔ ریڑھ
کی ہڈی بھی کٹ گئی تھی۔ پیٹ کے دو زخم معدے کے تھے اور چوتھا
زخم جو ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق فوری موت کا باعث بنا دل کا تھا۔
برچھی نے دل کو صاف چیر دیا تھا۔ ان کے علاوہ جسم پر ہلکی سی خراش
بھی نہیں تھی۔

خون آلود پوسٹ کارڈ میں صادق علی نے مقتول کو ایک فقرہ
تھا ـــــ "تم اپنی جگہ قائم رہو اور اپنا گھر آباد کرو" ـــــ اگر میں اتنی لمبی
مدّت بعد بھول نہیں گیا تو الفاظ کچھ ایسے ہی تھے۔ میں نے صادق
سے کہا کہ وہ مجھے اس فقرے کا مطلب بتائے اور مقتول کے متعلق
کچھ جانتا ہے بتا دے۔ اُس نے اس فقرے کا مطلب یہ بتایا کہ مقتو
ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔ ان کی شادی
ہو سکی۔ مقتول کی شادی اپنے چچا کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی۔ مقتول او
صادق علی میں گہری دوستی تھی۔ مقتول نے صادق علی کو بتایا تھا کہ وہ لڑ
جس کے ساتھ مقتول کی محبت تھی، بڑی سخت اور زہریلی طبیعت کی
لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی۔ اُس کا نام فاطمہ بی بی تھا۔ لوگ اُسے
فاطی کہتے تھے۔ وہ شادی کے بعد بھی مقتول سے ملنا چاہتی تھی او
اُسے بلاتی رہتی تھی مگر مقتول اپنا گھر برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شاد
کو ابھی دو ہی مہینے گزرے تھے۔ حوالدار صادق علی ڈیڑھ مہینے کی چھٹ
پر گاؤں گیا تھا۔ کوئی پندرہ دن گزرے مقتول نے صادق علی کو خط لکھ
تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ فاطی اُسے پریشان کرتی ہے۔ مقتول ا
شادی کے بعد ایک بار ملا تھا اور اسے کہا تھا کہ وہ اب اس کے ساتھ
تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ اس پر لڑکی نے اُسے دھمکی دی ہے کہ اس کا
نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ اس کے جواب میں صادق علی نے مقتول کو لکھا
تھا کہ تم اپنی جگہ قائم رہو اور اپنا گھر آباد کرو۔

صادق علی نے بتایا کہ گاؤں میں پچانوے فیصد گھر اُن کی اپنی
ن برادری کے ہیں۔ دشمنی عداوت بھی چلتی رہتی ہے۔ قتل کی
داتیں بھی ہو جاتی ہیں لیکن مقتول کے ساتھ کسی کی ایسی دشمنی نہیں
کہ اُسے قتل کر دیا جاتا۔ یہ کوئی اور معاملہ تھا۔ میں نے ایک قدرتی
سوال پوچھا ـــــ "کیا لڑکی کی شادی ہو گئی ہے؟" ـــــ صادق علی نے
یا کہ شادی نہیں ہوئی، منگنی ہو گئی ہے۔ یہاں سے میرے دل میں قتل
یہ وجہ آئی کہ مقتول شادی کے بعد بھی فاطی سے ملتا ہوگا اور فاطی
باپ یا بھائیوں یا منگیتر نے اُسے قتل کر دیا ہوگا۔ ضروری نہیں کہ
تول نے صادق علی کو صحیح نہ بتایا ہو کہ وہ فاطی سے ملتا رہتا ہے ـــــ
نے فاطی کے باپ اور بھائیوں کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسے ہیں؟
ادق علی نے بتایا کہ فاطی کا باپ سوتیلا ہے۔ فاطی کا صرف ایک
ائی ہے جس کی عمر تیرہ چودہ سال ہے۔ فاطی کی عمر بیس سال کے
یب ہے۔ وہ بارہ تیرہ سال کی تھی جب اس کا باپ مر گیا۔ ڈیڑھ دو
ال بعد گاؤں کے ایک آدمی نے جس کی بیوی مر چکی تھی اور بے اولاد
ھا، فاطی کی ماں کے ساتھ شادی کر لی۔ فاطی کا باپ بڑا ہی ظالم آدمی
تھا۔ فاطی کو مارتا پیٹتا رہتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ گھر میں بیٹی کے
جود کو پسند نہیں کرتا تھا۔

یہ ظالم باپ مر گیا تو ڈیڑھ دو سال بعد سوتیلا باپ مل گیا۔ اس
کے متعلق صادق علی نے بتایا کہ عیاش اور شرابی ہے۔ زمیندارہ اچھا

ہے۔ شہر دور نہیں۔ وہاں جاکر ہندوؤں کے ساتھ شراب پیا کرتا
فاطی بڑی خوبصورت نکلی۔ سوتیلے باپ نے اسے بڑے قیمتی کپڑے
اور زیورات سے سجانا شروع کر دیا۔ لڑکی کھل گئی اور مردوں کے
آنے لگی۔ صادق علی نے بتایا کہ لوگوں کو شک ہے کہ اس سوتیلے باپ
نے فاطی کی ماں کی بجائے فاطی کو دلہن بنا رکھا ہے اور اسی لڑکی کی
اُس کی ماں کے ساتھ شادی کی ہے۔ لڑکی کے دلیرانہ لچھن بتاتے ہیں
کہ اسے سوتیلے باپ کی طرف سے شہ بھی مل رہی ہے۔ پیار بھی مل رہا
ہے اور منہ مانگے پیسے بھی مل رہے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ سوتیلا باپ
فاطی کی ماں کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا ہے اور اُسے ڈرا دھمکا کر
اُس کی زبان بند رکھتا ہے۔ برادری اس لیے خاموش ہے کہ ایک
یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ دوسرے اس لیے کہ سوتیلے باپ کا یارانہ پولیس
کے ساتھ اور شہر کے غنڈوں بدمعاشوں کے ساتھ بھی ہے۔ اس
کے پاس پیسہ اتنا ہے کہ گاؤں میں کسی کو کتنی ہی رقم درکار ہو یہ شخص
کسی کو ہندو ساہوکار سے قرض نہیں لینے دیتا۔ خود رقم دیتا ہے۔ کوئی
سود نہیں لیتا اور نہ واپسی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس سے گاؤں کے
لوگ اس کے احسان مند ہیں اور اس کے ذاتی کاموں میں دخل نہیں
دیتے۔

مقتول بڑا دلیر جوان تھا۔ ساری برادری کی طرح لٹھ باز اور برچھی
باز بھی تھا۔ کوئی ایک سال گزرا فاطی اسے چاہنے لگی اور ان کی ملاقاتیں

ہونے لگیں۔ صادق علی کی اطلاع کے مطابق ان کی محبت پاک نہیں تھی۔
میری اپنی رائے بھی یہی تھی کہ ایسی لڑکی پاک ہو ہی نہیں سکتی جیسے سگے
باپ نے ظلم کا نشانہ بنائے رکھا اور سوتیلے باپ نے اسے شہزادی بنا کر
اپنی دلہن بنا لیا۔ ان حالات میں پلی ہوئی لڑکی یا لڑکے میں حیوانی جذبہ
زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے نفسیات کا مطالعہ تو اتنا گہرا نہیں کیا مگر پچیس
سال انسانوں کا جو مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس لڑکی کی نفسیات
کو سمجھ گیا...... صادق علی نے بتایا کہ مقتول فاطی کے ساتھ شادی کرنا
چاہتا تھا جو دو وجوہات سے نہیں ہو سکی تھی۔ ایک یہ کہ لڑکی بدنام ہو چکی
تھی اور دوسری یہ کہ مقتول کے ایک چچا کی جوان بیٹی تھی۔ دوسرے گھر
میں شادی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

مقتول کی منگنی چچا کی بیٹی کے ساتھ ہو گئی۔ حوالدار صادق علی چھٹی
لے کر گاؤں آیا تو مقتول نے اُسے بتایا کہ فاطی نے اُسے کہا تھا کہ گھر سے
بھاگ چلیں لیکن وہ ایک بدکار لڑکی کے لیے اپنے ماں باپ کی رسوائی
نہیں کرنا چاہتا تھا۔ فاطی نے اُسے دھمکی دی کہ اگر اُس نے چچا کی بیٹی
کے ساتھ شادی کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔ شادی سے پہلے، محبت
کے ناروا کھیل کے دوران، مقتول نے صادق کو یہ بھی بتایا کہ مقتول کا ہم عمر
ایک جوان جس کا نام عبدالعلی ہے اور لوگ اسے عبدو کہتے ہیں، فاطی کے
پیچھے پڑ گیا اور اسے پھانسنے کی کوشش کرنے لگا۔ فاطی نے اُسے ٹھکرا دیا۔
عبدو بڑا دلیر اور زہری جوان ہے۔ اُس نے کوششیں جاری رکھیں اور

فاطی سے یہ بھی کہا کہ وہ اس کا رشتہ لے لے گا۔ مقتول کے کہنے کے مطابق
جو مجھے صادق علی کی زبانی پتہ چلا، فاطی نے عبدو سے کہا کہ میرا رشتہ لو گے
تو میں نکاح کے لیے بھری محفل میں انکار کردوں گی اور اگر انکار نہ کرسکی تو
تمہیں مجبور کردوں گی کہ مجھے طلاق دے دو۔ طلاق نہیں دو گے تو ساری
عمر پچھتاؤ گے۔

مقتول نے صادق علی کو یہ بھی بتایا تھا کہ ایک بار مقتول نے عبدو کو
طعنہ دیا تھا کہ فاطی اُسے سوئی کی نوک پر بھی نہیں لکھتی اور ایک بار مقتول
نے اُسے چیلنج بھی کیا تھا۔ مرد اور وہ بھی ایسے خونخوار قبیلے کا مرد، ایسے
طعنے اور چیلنج برداشت نہیں کرسکتا۔ دیہات کے پسماندہ لوگ جو پسماندگی
کو غیرت مندی کہا کرتے ہیں، بڑی ہی خطرناک جوابی کارروائی کیا کرتے ہیں
صادق علی نے یہ بتا کر مجھے چونکا دیا کہ مقتول کی شادی کے بعد فاطی اور عبدو
کی منگنی ہوگئی ہے۔ شادی کا دن ابھی مقرر نہیں ہوا۔ یہ سن کر میرے دماغ
میں آئی کہ منگنی کے بعد عبدو نے فاطی کی بے رخی دیکھ کر مقتول کو راستے سے
ہٹانے کے لیے قتل کردیا ہوگا۔ لاش غائب کرنے کا یہ طریقہ آج بھی رائج
ہے کہ لاش کو ٹرنک میں ڈالا اور ریل گاڑی میں رکھ آئے۔ میرے دور
ملازمت میں بھی یہی ہوتا تھا کہ جہاں لاش پکڑی گئی وہاں کے تھانیدار
نے رسمی سی کارروائی کی اور لاش لاوارث قرار دے کر دفن کرادی۔ آج
بھی ایسی لاشوں کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ
عبدو یا کوئی بھی قاتل تھا، بہت ہوشیار آدمی تھا۔

میں نے فاطی کے متعلق پوچھا تو صادق علی نے بتایا کہ بہت دلیر لڑکی
ہے۔ شہروں کے تعلیم یافتہ لوگ ایسی دلیری کو بے حیائی سمجھتے ہیں۔
یہ بتایا گیا کہ مقتول گرمیوں میں چھت پر سویا کرتا تھا۔ گھر کے دوسرے
افراد صحن میں سوتے تھے۔ دو دفعہ ایسا ہوا کہ فاطی آدھی رات کے
وقت پچھواڑے سے چڑھ کر مقتول کے پاس گئی۔ اس سے زیادہ اور
دلیری کیا ہوسکتی ہے۔ عبدو کے متعلق صادق علی نے بتایا کہ وہ تو
بے خوف جوان ہے اور بگڑا ہوا۔ ماں باپ کا اکیلا بیٹا ہے۔ پیار اتنا
ملا کہ شہزادہ بن گیا۔ زمین بہت ہے جو بٹائی پر دی ہوئی ہے۔ منہ زور
لڑکا ہے۔ گاؤں میں کوئی اُس کے منہ نہیں آتا۔ مرنے مارنے پر اُتر
آتا ہے۔

تینوں ڈوم ہتھکڑیوں میں بندھے مجھ سے تھوڑی دُور پرے ڈبے
میں بیٹھے تھے۔ تین کانسٹیبل ساتھ تھے۔ میں نے ڈوموں سے بھی پوچھ
گچھ کی۔ ان کی حالت بہت ہی بُری تھی۔ ایک بار وہ ایک دوسرے
کو گالی گلوچ کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ میں نے
کہا نہیں تھا کہ ٹرنک کو ہاتھ نہ لگاؤ، پکڑے جائیں گے۔ وہ ایک دوسرے
پر الزام لگا رہے تھے کہ ٹرنک اٹھانے کا مشورہ اس نے دیا تھا جیسا
کہ میں بتا چکا ہوں، اُس زمانے میں گاڑیوں میں رش نہیں ہوتا تھا۔ لوگ
مسافر گاڑی میں سوار ہونے سے پہلے ایسا ڈبہ دیکھتے تھے جس میں دو چار مسافر
بیٹھے ہوئے ہوں۔ یہ تینوں چھوٹے ڈبے میں تھے۔ رات تھی، ڈبے میں

ان کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ تینوں ایک ایک سیٹ پر سوئے ہوئے تھے۔ جب وہ پُراسرار آدمی ٹرنک رکھنے آیا تو ان تینوں میں سے صرف ایک کی آنکھ کھلی۔ اُس نے کھیس میں لپٹے ہوئے ایک آدمی کو ٹرنک سیٹ کے نیچے رکھتے اور جاتے۔ دیکھا تھا۔

لاش میرے گلے پڑ گئی

گاڑی نے ہمیں منزل پر پہنچا دیا۔ لاش کے لیے تھانے سے چارپائی منگوائی۔ ٹرنک بھی ساتھ تھا۔ یہ چیزیں ساتھ لیے تھانے گئے۔ وہاں کنور دیوان سنگھ ایک ہندو راجپوت سب انسپکٹر تھانے کا انچارج تھا۔ لاش، ٹرنک، ڈوم، حوالدار صادق علی اور کاغذات اُس کے سپرد کرنے لگا تو اُس نے وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا پہلے یہ دیکھنا ہے کہ مقتول اُسی کے تھانے کا ہے اور یہ کیس اُس کا ہے بھی یا نہیں۔ حوالدار صادق علی کے بتائے ہوئے گاؤں سے مقتول کے باپ اور مکھیا (نمبردار) کو بلانے کے لیے کانسٹیبل بھیج دیا۔ فاصلہ تقریباً ڈیڑھ میل تھا۔ مطلوبہ افراد آئے تو مقتول کے باپ کے ساتھ اُس کے چچے تائے، بھائی اور کچھ اور لوگ بھی تھے۔ لاش کا منہ دیکھتے ہی کہرام مچ گیا۔ مقتول کے باپ اور مکھیا نے لاش کی شناخت کی۔ اس کے باوجود کنور دیوان سنگھ نے کیس لینے سے انکار کر دیا۔ یہ صریحاً دھاندلی تھی۔ اُس نے

ٹیلیفون اٹھایا اور ضلع پولیس ہیڈکوارٹر سے بات کی۔ میں بھی اسی ہیڈکوارٹر کے ماتحت تھا۔ اُدھر ایک انگریز ڈی۔ ایس۔ پی، ایم۔ بی۔ وُڈ بول رہا تھا۔ کنور دیوان سنگھ مجھ سے کیس نہ لینے کا بڑا ہی غیر قانونی جواز پیش کر رہا تھا۔ انگریز ڈی۔ ایس پی نے میرے ساتھ بات کی۔ کم بخت نے میری ایک نہ سنی۔ مجھے حکم دیا کہ تفتیش تم نے شروع کی ہے، اسے تم ہی ختم کرو۔

حکم کے آگے میں بول نہ سکا۔ پولیس کے قاعدے قانون کی اس خلاف ورزی پر میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں نے یہ ارادہ بھی کیا کہ ایس۔ پی سے بات کروں لیکن اس ڈر سے جرأت نہ کر سکا کہ ایم۔ بی۔ وُڈ ایک خبیث ڈی۔ ایس۔ پی تھا۔ میں ایس۔ پی سے اپنی بات ضرور منوا لیتا مگر ڈی ایس پی اُن چند انگریزوں میں سے تھا جو رشوت اور بدکاری کو جائز سمجھتے تھے۔ کنور دیوان سنگھ کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ ایم۔ بی۔ وُڈ کو صرف روپے پیسے کی نہیں، لڑکیوں اور شراب کی بھی رشوت دیتا رہتا تھا۔ یہ انگریز ڈی ایس پی اس علاقے میں شکار پر آتا تو کنور دیوان سنگھ ریسٹ ہاؤس کو اِندر سبھا بنا دیا کرتا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تین سال بعد جب جنگِ عظیم شروع ہوئے ڈیڑھ دو سال گزر گئے تھے، ایک بھگوڑے فوجی نے کنور دیوان سنگھ کو ایسے وحشیانہ طریقے سے قتل کر دیا تھا کہ اُس کا سر الگ تھا، دونوں بازو اور دونوں ٹانگیں الگ تھیں۔ پیٹ اس طرح کھلا ہوا تھا کہ دل، جگر اور انتڑیاں وغیرہ الگ الگ باہر

بڑی تھیں۔ قاتل بھی ہندو راجپوت تھا۔ کنور دلیوان سنگھ نے انسپکٹری اور ڈی۔ ایس۔ پی، ایم بی وُڈ کی دوستی کے نشے میں قاتل کی غیر شادی شدہ بہن کو ریسٹ ہاؤس میں بلا کر خراب کیا تھا۔ اس کے والدین نے اپنے بیٹے کو خط لکھا۔ وہ جھانسی چھاؤنی میں تھا۔ وہ فوج سے بغیر چھٹی غیر حاضر ہُوا۔ کنور دلیوان سنگھ کو اُس کے گھر میں قتل کیا لیکن بھاگ نہ سکا۔

ایک بدکار سب انسپکٹر اور راشی ڈی ایس پی نے میرے ساتھ یہ زیادتی کی کہ ساٹھ میل دور کا کیس میرے سر ڈال دیا۔ اس میں ہندووانہ ذہنیت بھی شامل تھی۔ یہ ہندو مجھے مسلمان سمجھ کر خراب بھی کرنا چاہتا تھا۔ اُس وقت تک میری مسلم دوستی مشہور ہو چکی تھی۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ تہیہ کر لیا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر قاتل یا قاتلوں کو پکڑوں گا اور اس کے بعد اس غیر قانونی حکم کے خلاف کارروائی کروں گا۔ مگر ڈی ایس پی نے میری کارروائی کا راستہ اس طرح بند کر دیا کہ چھٹی بھیج دی جس میں لکھا تھا کہ مجھے عارضی ڈیوٹی کے لیے اس تھانے میں تعینات کیا گیا ہے۔ ساتھ یہ بھی لکھا تھا کہ اس تھانے کا سٹاف تمہاری مدد کرے گا۔ اس طرح یہ حکم قانونی ہو گیا۔

میں نے تھانے کی بجائے ریسٹ ہاؤس میں ڈیرے ڈال دیئے۔ مجھے ڈر تھا کہ کنور دلیوان سنگھ تعاون نہیں کرے گا لیکن وہ میرے آگے بچھا جا رہا تھا۔ اُس نے میرے کھانے اور دیگر ضرورت کا بندوبست ایسا کیا جیسے میں پولیس کپتان تھا۔ میں نے لاش وارثوں کے حوالے کر دی۔ تینوں

ڈُوموں کو حوالات میں بند کر دیا۔ حوالدار صادق علی کو یہ کہہ کر گاؤں بھیج دیا کہ گاؤں سے غیر حاضر نہ ہو اور در پردہ قاتل کا سراغ لگانے کی کوشش کرے۔ وہ تو بہت بھڑکا ہُوا تھا۔ اس نے کہا ــــ "قاتل کا سراغ مل گیا تو وہ آپ تک زندہ نہیں پہنچے گا۔ حسین (مقتول) میرا جگری دوست تھا۔ میں نے اُس کے خون کا بدلہ نہ لیا تو وہ اگلے جہان مجھے شرمسار کرے گا"۔ وہی نہیں مقتول کی لاش لینے کے لیے جو لوگ آئے تھے وہ بھی ایسی ہی باتیں کر رہے تھے۔ بار بار یہی کہتے تھے کہ سامنے آئے تو دیکھیں گے۔ میں نے انہیں کفن دفن کا وقت دے دیا اور دوسرے دن مقتول کے باپ، ماں، بیوی اور بھائیوں کو ریسٹ ہاؤس میں آنے کے لیے کہا۔ حوالدار صادق علی کو گاؤں میں رہنے کے لیے کہا۔ اُسے میں زیادہ دن روک نہیں سکتا تھا۔ ضرورت پوری ہو چکی تھی۔ نمبردار سے کہا کہ وہ چوکیدار کو بلائے اور میرے ساتھ رہے۔ کنور دلیوان سنگھ سے میں نے کہا کہ وہ اپنے مخبروں سے کہے کہ گاؤں کے فلاں فلاں آدمی پر نظر رکھیں۔

خون اور منگنی کی انگوٹھی

چوکیدار جب آیا تو رات ہو چکی تھی۔ میں نے نمبردار اور چوکیدار سے فاطی، مقتول، فاطی کے منگیتر عبدو، فاطی کے سوتیلے باپ اور مقتول کے گھر کے متعلق معلومات لیں۔ انہوں نے تقریباً وہی باتیں کیں جو حوالدار صادق علی

بتا چکا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق موت کا جو وقت معلوم ہُوا تھا، وہ رات کے پہلے پہر کا تھا۔ قتل ہوئے چوتھا دن گزر گیا تھا۔ میں نے نمبردار اور چوکیدار سے کہا کہ گاؤں سے یہ پتہ کریں کہ مقتول کو فلاں رات اور فلاں وقت گاؤں سے باہر جاتے کسی نے دیکھا تھا؟ اگر دیکھا تھا تو کیا وہ کسی کے ساتھ تھا؟ —— انہیں اُسی وقت گاؤں بھیج دیا اور خود دماغ پر زور دینے لگا۔ میں اس علاقے میں اجنبی تھا۔ کسی سے جان نہ پہچان۔ مخبروں کی ذہنیت اور فطرت سے واقفیت نہیں تھی۔ لاش اور ٹرنک تو گواہی دے نہیں سکتے تھے۔

دوسرے دن میں نے جن افراد کو بلایا تھا، وہ آ گئے۔ ان کے ساتھ اور بھی بہت سے آدمی تھے۔ زیادہ تر آدمیوں کے پاس برچھیاں تھیں۔ میں نے برچھیوں کو غور سے دیکھا۔ زیادہ تر کے پھل تین دھارے تھے۔ سب سے پہلے میں نے مقتول کے باپ کو بلایا۔ میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اُس نے بتایا کہ کسی کے ساتھ ایسی دشمنی نہیں تھی کہ میرے بیٹے کو قتل کر دیا جاتا۔ برادری میں قتل اور زخمی ہوتے رہتے ہیں لیکن براہِ راست کسی سے عداوت نہیں تھی۔ فاطی کے متعلق باپ نے بتایا کہ مقتول کے اس کے ساتھ مراسم تھے۔ باپ نے اُسے کئی بار روکا تھا مگر مقتول نے اپنی ماں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ وہ فاطی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ماں نے اس کے باپ سے بات کی۔ باپ نے مقتول کو ڈانٹ کر کہا کہ لڑکی بدنام ہے اور اس کا سوتیلا باپ بھی اچھے چال چلن کا انسان نہیں۔ شراب بھی پیتا ہے۔ باپ نے فاطی کا رشتہ نہ

لینے کی سب سے بڑی وجہ یہ بتائی کہ اُس کے سگے بھائی کی بیٹی جوان تھی جسے دستور کے مطابق مقتول کے گھر آنا تھا۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کیا مقتول شام کے بعد گھر سے نکلنے اور دیر تک باہر رہنے کا عادی تھا باپ نے کہا کہ شادی سے پہلے کبھی کبھی نکل جاتا تھا اور ذرا دیر سے آتا تھا۔ شادی کے بعد ایسا موقعہ کبھی نہیں آیا۔ باپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ مقتول شادی کے بعد بھی فاطی سے ملتا رہا یا نہیں۔

باپ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قتل کی رات مقتول کس وقت گھر سے نکلا کیونکہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ الگ کمرے میں ہوتا تھا۔ اس کی بیوی نے آدھی رات کے بعد اُس کے باپ کو جگا کر بتایا تھا کہ مقتول کچھ بتائے بغیر باہر چلا گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ گاؤں والوں کو اُس کی گمشدگی کا علم ہو گیا۔ انہوں نے تین دن انتظار کیا پھر پولیس کو رپورٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ اتنے میں انہیں مقتول کی لاش مل گئی۔

مقتول کی ماں نے اُس کے باپ کے بیان کی تائید کی۔ یہ بھی کہا کہ وہ فاطی کے ساتھ شادی کرنے کی ضد کرتا تھا۔ اُسے اس نے بڑی ہی مشکل سے سمجھایا اور چچا کی بیٹی کے ساتھ شادی کے لیے راضی کیا تھا۔ شادی کے بعد گھر میں مقتول کا رویّہ اچھا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کے ساتھ بھی بدسلوکی نہیں کی۔ شادی کو ابھی دو مہینے ہی ہوئے تھے، ماں کو بھی علم نہیں تھا کہ مقتول کس وقت گھر سے نکلا تھا۔ اُسے آدھی رات کو پتہ چلا تھا کہ وہ گھر نہیں ہے۔ ماں کی جذباتی حالت بہت بُری تھی۔ بولتی کم اور

روتی زیادہ تھی۔ اُسے باہر بھیج کر مقتول کی بیوی کو بلایا۔ سولہ سترہ سال عمر کی اس لڑکی پر مجھے ترس آ گیا۔ اسی عمر میں دو ہی ماہ بعد بیوہ ہو جانا بڑا حادثہ ہوتا ہے۔ اُس نے میرے سوالوں کے جواب میں بتایا کہ اُس کے ساتھ مقتول کا سلوک اچھا تھا۔ کبھی بے رخی بھی نہیں کی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ مقتول شادی سے پہلے فاطی سے ملتا جلتا تھا۔ اُس نے شادی کی دوسری تیسری رات مقتول سے پوچھا تھا کہ وہ اُسے دھوکہ تو نہیں دے گا؟ مقتول نے اُسے قسم کھا کر یقین دلایا تھا کہ اُس نے فاطی سے تعلق توڑ دیا ہے۔ قتل کی رات جب لوگ سو گئے، مقتول اپنی بیوی کے پاس تھا۔ بستر سے اٹھا اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا کہ ابھی آتا ہوں۔ پھر نہیں آیا۔

"وہ کوئی ہتھیار لے کر نکلا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں"— لڑکی نے جواب دیا۔ "خالی ہاتھ گیا تھا۔"

"اس سے پہلے وہ غصے میں تھا؟" — میں نے پوچھا۔ "تم نے اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی دیکھی تھی؟"

"نہیں" اُس نے جواب دیا۔ "وہ روزمرّہ کی طرح تھا۔"

"باہر سے کوئی آواز آئی تھی؟" — میں نے پوچھا۔ "مثلاً کسی نے باہر سے اس کو آواز دی ہو یا کسی نے گلی میں سے گزرتے گزرتے ہوک لگائی ہو؟"

لڑکی نے یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں، بالکل خاموشی تھی"

"ذرا اور یاد کرو" — میں نے کہا۔ "باہر کُتا بولا تھا؟ بلّی کی میاؤں سنائی دی تھی؟ یا کوئی اور آواز خواہ کسی جانور یا پرندے کی ہو؟"

اُسے ایسی کوئی آواز یاد نہیں تھی۔ دیہات میں کسی کو چوری چھپے بلانے کے لیے مختلف آوازیں استعمال ہوتی ہیں۔ میں نے لڑکی سے چند اور باتیں پوچھیں اور اُسے باہر بھیج دیا۔ اس سے گھنٹہ ڈیڑھ بعد نمبردار اور چوکیدار آ گئے۔ وہ اپنے ساتھ گاؤں کے تین آدمی لائے تھے۔ تینوں غریب سے کسان تھے۔ ان میں سے ایک نے بتایا کہ اُس نے قتل کی رات مقتول کو گاؤں سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ ان کا آمنا سامنا اچانک ہو گیا تھا۔ اُس نے مقتول سے پوچھا تھا کہ اس وقت کدھر جا رہے ہو۔ اُس نے اتنی دھیمی آواز میں جواب دیا تھا جو اس آدمی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مقتول کھیتوں کی طرف چلا گیا تھا۔ اس آدمی نے یہ بھی بتایا کہ تین چار کھیت دور اُسے کوئی اور بھی جاتا نظر آیا تھا۔ سر پر پگڑی نہیں دوپٹہ لگتا تھا۔ وہ کوئی عورت لگتی تھی۔ یہ آدمی دونوں کو دیکھتا رہا تھا۔ دونوں کا رُخ ایک ہی سمت تھا اور وہ ایک دوسرے سے دُور دُور جا رہے تھے۔ اس آدمی نے اُن کا پیچھا نہ کیا۔

نمبردار کے ساتھ جو دوسرے دو آدمی تھے وہ میرے لیے رحمت کے فرشتے ثابت ہوئے۔ یہ چوکیدار کا کمال تھا کہ دو روز پہلے گپ شپ کے انداز میں سُنی ہوئی ایک بات کو اس نے اہمیت دی اور ان دو آدمیوں کو ساتھ لے آیا۔ ان دونوں میں سے ایک نے قتل کی رات کے اگلے روز کسی کے ساتھ باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ اس نے گاؤں اور شہر کے درمیان ایک جگہ بہت سا خون دیکھا ہے۔ یہ بات چوکیدار کے کان میں بھی پڑی

تھی۔ قتل کے پانچویں روز اُسے اچانک یاد آگئی۔ اس نے نمبردار کو بتائی۔ نمبردار نے اس آدمی سے پوچھا۔ اُس نے ایک اور آدمی کا نام لیا جو اُس کے ساتھ تھا۔ نمبردار اور چوکیدار ان دونوں کو میرے پاس لے آئے۔ میں نے انہیں پوری بات سنانے کو کہا تو انہوں نے مختصر سی یہ بات سنائی کہ ایک نشیبی جگہ پر انہوں نے خون دیکھا تھا۔ انسانی پاؤں کے نشان بھی تھے۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی آدمی کو یہاں زخمی کیا گیا ہو اور زخمی یہاں پڑا رہا ہو۔ انہوں نے دیکھا کہ اپنے گاؤں میں سب خیریت سے ہیں تو انہوں نے کسی سے بات نہ کی۔ غریب آدمی پولیس سے ڈرتے تھے۔ ایک روز بعد انہیں حسین کی گمشدگی کا علم ہوا تو وہ اس ڈر سے خاموش رہے کہ اس کے گھر والے ماریں گے کہ انہیں اُسی روز کیوں نہ بتایا۔ ان میں سے ایک نے کسی کے ساتھ ویسے ہی بات کی تھی۔

میں نے آپ کو پہلی کہانیوں میں سنایا ہے کہ موقعۂ واردات سے اکثر کام کی کوئی چیز مل جاتی ہے۔ خواہ وہ ایک بال ہی کیوں نہ ہو۔ عادی اور استاد مجرم ایسے سراغ نہیں چھوڑا کرتے۔ اتفاقیہ جرم کرنے والے کوئی نہ کوئی سراغ چھوڑ جاتے ہیں۔ میرے لیے اب اس واردات کی جگہ بیکار تھی۔ پانچ دن گزر گئے تھے۔ کھُرے کھوج کی اُمید بے معنی تھی۔ میں نے ان آدمیوں سے پوچھا — "موقعۂ واردات پر تم نے کوئی چیز پڑی دیکھی تھی؟" — میں نے یہ سوال عادت کے تحت کر ڈالا تھا۔ میرے ذہن میں کچھ بھی نہ تھا لیکن میں نے دیکھا کہ ہوا میں چلایا ہوا تیر غالباً کسی نشانے

پر جا لگا تھا۔ دونوں آدمیوں کے رنگ اُڑ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پولیس آفیسر چہروں کے بدلتے ہوئے رنگ کو خوب پہچانتے ہیں۔ مجھے اس کا خصوصی تجربہ تھا۔ میں نے انہیں سنبھلنے نہ دیا نہ اُن کے جواب کا انتظار کیا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا — "شاباش، وہ چیز مجھے دے دو"۔ وہ بیچارے غریب سے کسان تھے۔ پولیس کے خوف نے انہیں ہپناٹائز کر لیا۔ ایک کے منہ سے سرگوشی کے لہجے میں نکل گیا۔ "اَن داتا! وہ چیز ہمارے پاس نہیں۔ سنار کو دے دی تھی"۔ دونوں نے میرے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور رو رو کر التجا کرنے لگے کہ انگوٹھی انہیں زمین پر پڑی ملی تھی، انہیں بخش دیا جائے کیونکہ وہ بہت غریب ہیں اور انگوٹھی انہوں نے چوری نہیں کی۔ دراصل یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خون دیکھا، انسانی پاؤں کے نشان بھی دیکھے اور گاؤں والوں کو نہ بتایا۔ وہ انگوٹھی ہضم کرنا چاہتے تھے۔

مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ انہیں موقعۂ واردات سے انگوٹھی ملی تھی، اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگر انگوٹھی ملی تھی تو وہ کس کی تھی۔ مقتول کی ہی ہو سکتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ شہر کے ایک سنار کے پاس انہوں نے انگوٹھی سولہ روپوں میں بیچی اور آٹھ آٹھ روپے تقسیم کر لیے تھے۔ میں اُسی وقت انہیں ساتھ لے گیا۔ ان کی راہنمائی میں سنار کی دکان پر گئے۔ مجھے معلوم تھا کہ سنار کسی سے زیور خریدیں تو فوراً پگھلا ڈالتے ہیں تاکہ مال چوری کا ہو تو اس کا نشان ہی نہ رہے۔ سنار نے بتا دیا کہ

اُس نے ان دنوں سے سونے کی ایک انگوٹھی خریدی تھی۔ اس قصبے میں سناروں کی کل تین دکانیں تھیں۔ سنار ایک دوسرے کے تیار کیے ہوئے زیورات پہچان لیتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا — "انگوٹھی نئی تھی؟ اور اگر نئی تھی تو کس کی بنی ہوئی تھی؟" اتفاق سے انگوٹھی اسی کی دکان کی بنی ہوئی تھی اور نئی تھی۔ وہ مجھے بتا نہ سکا کہ اس کا خریدار کون تھا۔ اُن دنوں زنانہ انگوٹھیوں کا یہ نیا ڈیزائن تیار ہوا تھا۔ میں نے اُسے مقتول کے گاؤں کا نام لے کر کہا کہ یاد کر کے بتاؤ کہ انگوٹھی اس گاؤں میں تو نہیں گئی تھی؟

اُس نے ذہن پر زور دیا تو اُسے فاطی کے منگیتر کا نام یاد آگیا۔ اس نے کہا — "دس بارہ روز گزرے وہ اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا اور اُس نے خاصا زیور خریدا تھا۔ اس سے پہلے اس نے یہ انگوٹھی خریدی تھی۔ کہتا تھا کہ منگنی کے لیے لڑکی کو پہنانی ہے۔ اس کے پاس انگلی کا صحیح سائز نہیں تھا۔ اپنی چھوٹی انگلی میں انگوٹھی ڈال کر اُس نے کہا تھا کہ یہ پوری ہوگی۔"

سنار نے یہ انگوٹھی اکیس روپے اور دو چار آنے پر بیچی تھی۔ اُس زمانے میں سونا بہت سستا تھا۔ یہ انگوٹھی نگ اور پتھر کی وجہ سے مہنگی بیچی گئی تھی۔ میں نے سنار سے یہ نہ کہا کہ اُس نے یہ جانتے ہوئے کہ انگوٹھی کسی اور کی تھی، اس نے خرید کر جرم کیا ہے۔ مجھے تو اس پر خوشی تھی کہ اندھیرے میں خدا نے روشنی دکھا دی تھی۔ یہ انگوٹھی عبدو نے فاطی کو منگنی پر دی تھی جو موقعۂ واردات پر گر پڑی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ انگوٹھی کھلی تھی اور یہ بھی

کہ موقعۂ واردات پر فاطی موجود تھی، مگر سوال یہ تھا کہ قاتل کون ہے؟ میرے دماغ میں پہلا خیال یہ آیا کہ فاطی اور مقتول اکٹھے پکڑے گئے اور مقتول قتل ہوگیا۔ اگر یہی صورت تھی تو فاطی سے قاتل کی نشاندہی کرائی جا سکتی تھی... میں نے سنار سے کہا کہ اُس نے چوری کا مال خرید کر جرم کیا ہے۔ بہرحال میں اُسے کچھ نہیں کہوں گا بشرطیکہ وہ منہ بند رکھے۔ اگر عبدو آجائے تو اُسے نہ بتائے کہ میں یہاں آیا تھا یا انگوٹھی یہاں آئی تھی۔ اُس نے میرے کہنے پر مجھے بالکل اسی ڈیزائن کی ایک انگوٹھی دکھائی۔

میں نے دونوں آدمیوں کو اور سنار کو بھی گواہوں کی فہرست میں لکھ لیا اور انہیں خبردار کر دیا کہ کسی سے کوئی بات نہ کریں اور ہر وقت گھر دل میں حاضر رہیں۔ میں نے ریسٹ ہاؤس جا کر چوکیدار کے ساتھ دو کانسٹیبل اس ہدایت کے ساتھ گاؤں روانہ کر دیئے کہ عبدو، فاطی، فاطی کی ماں اور اُس کے باپ کو بلا لائیں لیکن عبدو کو الگ اور پہلے لائیں۔ وہ جب گاؤں سے نکل آئے تو پھر دوسروں کو لائیں۔ میں بہت ہی خوش تھا۔ میری آدھی تفتیش مکمل تھی۔ اب قاتل کا سراغ لگانا مشکل نہیں تھا۔

لڑکی نے مجھے پریشان کر دیا

سب سے پہلے عبدو آیا۔ اچھا خوبرو جوان تھا۔ عمر مقتول جتنی تھی۔

اُسے میں نے الگ بٹھا دیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد فاطی، اس کی ماں باپ آ گیا۔ باپ کی عمر چالیس سے ذرا کم ہی ہوگی۔ فاطی کی ماں کی عمر اس سے کم تھی لیکن ابھی جوان لگتی تھی۔ خدا نے اسے بڑا صاف رنگ اور اچھی شکل دی تھی۔ فاطی کی خوبصورتی کو میں اچھی طرح بیان نہیں کر سکوں گا۔ کچھ اور ہی قسم کا حسن تھا مگر یہ حسن پُراسرار قسم کا تھا جس میں مجھے کنوار پنے کی معصومیت نظر نہیں آتی تھی۔ اُس کی آنکھیں بہت ہی دلکش تھیں مگر اُن میں کوئی طلسم تھا۔ مختصر یہ کہ وہ غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کا کردار اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ چہرہ شناسی کی معمولی سی سُوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی کہہ سکتا تھا کہ یہ لڑکی مردوں کے سر کھلوا سکتی ہے اور یہ بھائی کو بھائی کا دشمن بنا سکتی ہے۔

اُس کا باپ میرے پاس آیا۔ تپاک سے ہاتھ ملایا۔ میرا نام پوچھا۔ پھر یہ پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں۔ میں برخورداری سے اُس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ اس نے کنور دیوان سنگھ کے ساتھ اپنے گہرے دوستانے کا اظہار کیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی، ایم۔ پی۔ وُڈ کا بھی نام لیا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ شکار پر جایا کرتا ہے..... کچھ دیر مجھ پر اپنی پوزیشن کا رعب گانٹھ کر اُس نے کہا ___ "آپ نے میری بیوی اور بیٹی کو بلایا ہے۔ اس سے میری بہت بے عزتی ہوئی ہے۔ یہ جو لڑکا قتل ہو گیا ہے کسی نے دشمنی سے مار ڈالا ہوگا۔ لڑکا بدچلن تھا۔ اُس نے اپنے کئے کی سزا پائی۔ مجھ جیسے عزت داروں کو خواہ مخواہ گھسیٹا جا رہا ہے۔ آپ میری بیوی اور بیٹی سے

کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟ وہ مجھ سے پوچھ لیں۔"

"محترم!" ___ میں نے اُسے کہا ___ "میں بہتر سمجھتا ہوں کہ مجھے کس سے کیا پوچھنا ہے۔ ایک جوان آدمی قتل ہو گیا ہے جیسے میں آپ کی طرح یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتا کہ لڑکا بدچلن تھا۔ اگر بدچلن کو قتل کرنے کی کھلی چھٹی ہوتی تو آج آپ زندہ نہ ہوتے۔ آپ باہر تشریف لے جائیں" ___ وہ باہر گیا تو میں نے کانسٹیبل سے کہا کہ فاطی کو اندر لے آؤ۔

لڑکی اندر آئی تو میں نے اُسے کرسی پر بٹھایا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُس کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی نہیں ہوگی۔ اُس کے ہاتھ دو گھوڑا بوسکی کی چادر میں تھے۔ میں نے پہلے تو اُس سے گپ شپ لڑائی۔ پھر کہا کہ اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ میں نے خوشی کا اظہار کر کے کہا کہ بچیاں اپنے خاوندوں کے گھروں میں اچھی لگتی ہیں۔ میں نے منگنی کے متعلق جذباتی سی باتیں کیں۔ اُس کا خوف دُور ہو چکا تھا۔ میں نے مذاق بھی کیا۔ وہ کھُل کر ہنسی۔ اُس میں شرم و حجاب نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں نے یہ جانتے ہوئے کہ منگنی کی انگوٹھی اُس کی انگلی میں نہیں ہوگی اس سے کہا ___ "منگنی کی انگوٹھی تو دکھاؤ" ___ مجھے توقع تھی کہ وہ کہے گی انگوٹھی گھر پڑی ہے، پھر میں اُسے گھر لے جاؤں گا اور کہوں گا کہ انگوٹھی دکھاؤ، مگر اُس نے چادر سے ہاتھ باہر نکال کر میری امیدوں اور منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ انگوٹھی اُس کی انگلی میں تھی اور وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی سنار نے مجھے دکھائی تھی۔ گھبراہٹ جو لڑکی پر طاری ہوئی تھی وہ مجھ پر

طاری ہو گئی۔ میں چکرا گیا۔

یہ اب عقل کا کھیل تھا۔ سنار کی اطلاع کے مطابق انگوٹھی عباد نے خریدی تھی اور یہ منگنی کی انگوٹھی تھی۔ تو کیا یہ بھی ممکن تھا کہ لڑکی کوئی اور تھی اور موقعہ واردات پر ہاتھا پائی میں یہ کسی اور وجہ سے انگوٹھی گر پڑی؟ مقتول کے ساتھ اس لڑکی کا کیا تعلق تھا؟ ایسے سوال تیزی سے میرے ذہن میں آئے اور میں نے ذہن پر اتنا زیادہ زور دیا کہ جسم کا سارا خون دماغ کی طرف چڑھ گیا۔ تھانیداروں کے لیے ایسے مرحلے بڑے ہی تکلیف دہ اور خطرناک ہوتے ہیں۔ ایسے ہی مرحلوں میں گھبرا کر تھانیدار جھوٹے گواہوں کا سہارا لیتے یا کمزور شہادت سے کورٹ میں کیس تباہ کرا لیتے ہیں۔ اگر تھانیدار فرائض سے دیانت داری کرے تو خدا یقیناً مدد کرتا ہے۔ یہ میرا عقیدہ ہے کہ ایک گناہ گار کو پکڑنے اور اسے سزا دلوانے والے کی خدا ضرور مدد کرتا ہے۔ اس لحاظ سے پولیس کا فرض مقدس ہے مگر پولیس والوں نے اپنے محکمے کو سب سے زیادہ بدنام محکمہ بنا دیا ہے۔

میں نے ہوا میں ایک اور تیر چلایا۔ فاطی کے ساتھ باتیں کرتے کرتے میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ کنور دیوان سنگھ نے مجھے اپنا ہیڈ کانسٹیبل دے رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ مسلمان تھا۔ گذشتہ رات وہ میرے پاس بیٹھا کنور دیوان سنگھ کی غلط حرکتوں کی باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کیس سے اُس نے اس لیے جان چھڑائی ہے کہ یہ قبیلہ بڑا ہی ظالم اور خونی

ہے۔ ان لوگوں میں سے شہادت اور گواہ ڈھونڈنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ اگر پولیس سختی کرے تو یہ لوگ پولیس کے خلاف کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ ڈی۔ ایس۔ پی کنور دیوان سنگھ کی مٹھی میں ہے۔ اس لیے یہ اس سے اپنی ہر بات منوا لیتا ہے ــــ ہیڈ کانسٹیبل ایسی بہت سی باتیں کرتا رہا اور اُس نے مجھے کہا تھا کہ کوئی فکر نہ کروں، وہ میری پوری مدد کرے گا۔ اس نے واقعی میری بہت مدد کی۔

میں فاطی کو اندر چھوڑ کر برآمدے میں گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل موجود تھا۔ اُسے انگوٹھی کے متعلق ساری بات بتائی اور اُسے بازار بھیج دیا۔ مسلمان ہونے کے علاوہ مجھے اس پر اس لیے بھی بھروسہ تھا کہ وہ ذہین آدمی تھا۔ میں اندر گیا اور فاطی سے پوچھا ــــ "مقتول کے ساتھ تمہارے تعلقات کتنا عرصہ رہے ہیں؟"

"میرا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا" ــــ اس نے خود اعتمادی سے جواب دیا۔

"تم ابھی بچی ہو فاطی!" ــــ میں نے نرم لہجے میں کہا ــــ "یہ تمہارا گاؤں نہیں۔ تم پولیس کے سامنے بیٹھی ہوئی ہو۔ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔ تمہارے منہ سے نکلی ہوئی ہر ایک بات یہاں لکھ لی جائے گی۔ ذرا سی بھی ہیرا پھیری کرو گی تو قید ہو جاؤ گی۔ سچ بولو گی تو فائدے میں رہو گی ... مجھے سوچ کر جواب دو کہ حسین (مقتول) کے ساتھ تمہارے تعلقات کتنا عرصہ رہے ہیں؟ اور یہ بھی سوچ لو کہ تمہارے تعلقات کا گواہ سارا

گاؤں ہے۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ میں نے اُس کی حوصلہ افزائی کی۔ آخر اس نے کہا — "اُس کی شادی ہو جانے تک۔"

"وہ اس کے بعد بھی تمہیں ملتا رہا ہے"۔ میں نے کہا۔

"نہیں"۔ اس نے جواب دیا۔

"عبدو نے تمہیں دوستی کے لیے کہا تھا تو تم نے انکار کیوں کیا تھا؟"

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا — "آپ کو یہ باتیں کس نے بتائی ہیں؟"

"جس نے حسنین کو قتل کیا ہے"۔ میں نے جواب دیا اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا اور وہ آنکھیں جھکا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ میں نے کہا — "مجھ سے کچھ نہیں چھپا سکو گی فاطی!"

"لیکن مجھے یہ تو پتہ نہیں کہ قاتل کون ہے"۔ اُس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کیا عبدو نے تمہیں حسنین کے ساتھ پکڑ لیا تھا؟"

"نہیں۔"

"تمہیں حسنین کے ساتھ کسی نے نہیں پکڑا تھا؟"

"نہیں۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"اُس کی شادی سے ایک مہینہ بعد کی بات ہے"۔ اُس نے جواب دیا — "قتل سے بہت دن پہلے میں اُسے ملی تھی۔"

"رات کا وقت تھا؟"

"ہاں!"

"اُسے تم نے بلایا تھا؟"

"ہاں!"

"کس طرح؟" میں نے پوچھا — "کسی کی زبانی پیغام بھیجا تھا؟"

اُس نے ایک خاص اشارہ بتایا جو اس نے دن کے وقت کیا تھا۔ یہ ان کا پرانا اشارہ تھا۔ اس نے ملاقات کی جگہ شہر اور گاؤں کے درمیان بتائی۔ مجھے ابھی وہ جگہ دیکھنی تھی۔ جن دو آدمیوں کو انگوٹھی ملی تھی، انہوں نے بھی شہر اور گاؤں کے درمیان ایک جگہ کی نشاندہی کی تو میں نے اُس جگہ ذرا جانا فائدہ مند نہیں سمجھا تھا کیونکہ قتل کو اتنے دن گزر گئے تھے۔ اب وہاں جانے سے کچھ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ جگہ تو بہرحال دیکھنی ہی تھی کیونکہ وہ جائے واردات تھی لیکن لڑکی نے بھی ایک جگہ کی نشاندہی کی تو میں نے اُسی وقت وہ جگہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ معلوم ہوا کہ وہاں تک یکہ جا سکتا ہے۔ میں نے دو یکے منگوائے۔ ایک میں لڑکی کو اپنے ساتھ بٹھایا، دوسرے میں انگوٹھی اٹھا کر بیچنے والے دونوں آدمیوں کو دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بٹھایا۔

قصبے سے چار پانچ فرلانگ دُور لڑکی نے یکہ رکوایا۔ ہم اُترے۔ اُس نے مجھے ایک جگہ دکھا کر کہا کہ اُن کی بیشتر ملاقاتیں یہاں ہوتی تھیں۔ دوسرا یکہ بھی رک گیا تھا۔ میں نے اشارے سے انہیں دُور رہنے کو کہا۔

وہ جگہ کشادہ تھی اور ذرا گہری۔ ارد گرد درخت، جھاڑیاں اور ایک طرف کھیت تھے۔ وہاں پکڑے جانے کا خطرہ کم تھا۔ لڑکی کو پرے بھیج کر دونوں آدمیوں کو بلایا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں انگوٹھی یہاں سے ملی تھی۔ زمین زیادہ کچی نہیں تھی اور کوئی ایسی پکی بھی نہیں تھی۔ خشک خون پر مٹی جم گئی تھی۔ پاؤں کے نشان گڈمڈ تھے۔ زمین یہ بتا رہی تھی کہ یہاں دو تین آدمیوں کی دھینگا مشتی ہوئی ہے۔ ارد گرد زمین کو بڑی ہی غور سے دیکھا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ مجھے یہ کامیابی ضرور حاصل ہوئی کہ فاطی کے متعلق یقین ہو گیا کہ اگر یہ قتل میں شریک نہیں تھی تو واردات کے ساتھ اس کا تعلق ضرور تھا۔

میں نے اسے کچھ بھی نہ کہا۔ جائے واردات کا نقشہ تیار کیا اور سب کو ریسٹ ہاؤس لے گیا۔ راستے میں فاطی نے میرے زانو پر ہاتھ رکھ کر پوچھا —"اب آپ کیا کریں گے؟"— میں نے اسے تسلی دی۔ میں اس کے گرد شہادت کی دیواریں کھڑی کر کے کہنا چاہتا تھا کہ اب کہو کیا کہنا چاہتی ہو...... اس کے ساتھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ میرے ذہن پر انگوٹھی سوار تھی۔ مجھے سنار کی بات یاد آ رہی تھی کہ عبدو کے پاس انگوٹھی کا یعنی لڑکی کی انگلی کا ناپ نہیں تھا۔ اس نے اپنی چھوٹی انگلی میں انگوٹھی ڈال کر کہا تھا کہ یہ ٹھیک رہے گی۔ میں نے اس سے یہ مطلب حاصل کیا کہ لڑکی کی انگلی میں انگوٹھی کھلی تھی جو یہاں گر پڑی۔ سوال یہ تھا کہ جو انگوٹھی لڑکی کی انگلی میں تھی وہ کہاں سے آئی۔ میں دعا کر رہا تھا کہ ہیڈ کانسٹیبل میری مرضی کا جواب لائے۔

مظلوم ماں، اوباش بیٹی

میرے عقیدے کے عین مطابق خدائے ذوالجلال نے میری مدد کی۔ ...یسٹ ہاؤس کے برآمدے میں سنار ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ...ں نے فاطی کو ایک کانسٹیبل کے حوالے کر دیا اور ہیڈ کانسٹیبل اور ...نار کو اندر لے گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا —"عبدو نے اس سے ایک ...ر انگوٹھی خریدی تھی"— آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں ...ے سنار سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ عبدو اس کے پاس آیا تھا اور یہ ...ہ کر ویسی ہی ایک اور انگوٹھی لے گیا تھا کہ کھلی تھی، کہیں گم ہو گئی ہے۔ ...نار نے جو دن بتایا وہ قتل سے ایک روز بعد کا دن تھا۔ میں نے سنار ...ے پوچھا کہ اس نے یہ بات مجھے اس وقت کیوں نہ بتائی جب میں اس کی ...ان پر گیا تھا؟ اس نے ہاتھ جوڑ کر بھکاریوں کی طرح جواب دیا "کاروبار ...ر گاہکی کا معاملہ ہے۔ اس نے کہا تھا کہ کسی کو بتانا نہیں کہ میں نے ایک ...ر انگوٹھی خریدی ہے۔ میں گاہک کو ناراض نہیں کر سکتا۔"

"تم نے اسے یہ تو نہیں بتایا ہو گا کہ اس کی جو انگوٹھی گم ہو گئی ہے، ...تمہارے پاس فروخت ہوئی ہے؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا —"یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں کہ میرے پاس ...انگوٹھی آئی ہے، وہ عبدو والی ہے۔ میری دکان سے ایسی کئی انگوٹھیاں

جاچکی ہیں۔ آپ نے ایک گاؤں کا نام لیا تو میں نے بتا دیا کہ اس گاؤں کا ایک آدمی اپنی ماں کے ساتھ آیا تھا اور زیورات لے گیا تھا۔"

"کیا تم عبدو کو پہچان لو گے؟"

"کیوں نہیں!" اس نے جواب دیا۔ "وہ باہر بیٹھا ہوا ہے۔ اُس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا تھا۔ شاید یہ کہہ رہا تھا کہ میں دوسری انگوٹھی کا ذکر یہاں نہ کروں۔" اُس نے میری منّت سماجت شروع کر دی۔

میں نے اُس کی شہادت کے متعلق چند ایک ہدایات دے کر اُسے دکان پر بھیج دیا اور فاطی کے منگیتر عبدو کو اندر بلایا۔ پہلے تو میں نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا پھر اس کے چہرے کا گہرا جائزہ لیا۔ میں اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ اس میں اتنا سنگین اور گھناؤنا جرم کرنے کی ہمت اور صلاحیت ہے؟ گٹھے ہوئے مضبوط جسم کا نوجوان تھا۔ میں نے اُسے سامنے بٹھا کر کہا۔ "دیکھو عبدو میاں! مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرنا تمہاری زبان تمہیں پھانسی کے تختے پر کھڑا کر سکتی ہے یا کالا پانی بھجوا سکتی ہے۔ میں جو کچھ پوچھوں سچ سچ بتا دینا۔ مجھے پریشان کرو گے تو پریشان ہو گے۔ میری مدد کرو گے تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں مسلمان ہوں۔"

"پوچھو پوچھو کیا پوچھتے ہو۔" اُس نے بڑی دلیری سے کہا جیسے مجھے کچھ سمجھتا ہی نہ ہو۔ اس ایک فقرے اور اُس کے لہجے سے میں سمجھ

ا کہ لڑکا اپنے آپ کو بہت دلیر سمجھتا ہے۔

"فاطی نے تمہیں قبول کر لیا ہے؟" میں نے اُس پر وار کرنے کے انداز ، پوچھا۔

"لڑکی کی کیا مجال ہے کہ قبول نہ کرے!"

"اُس نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ میں نکاح میں انکار کر دوں گی؟" میں نے ڈبدبے سے کہا ـــ "اُس نے تمہیں کہا نہیں تھا کہ طلاق لے لوں گی؟" ذرا سا گھبرایا۔ میں نے کہا۔ "کیا لڑکی کے ساتھ تم نے عہد نامہ کر لیا ، کہ وہ تمہیں دل سے قبول کرے گی؟"

"آپ ایسی باتیں کیوں پوچھتے ہیں؟" اُس نے اپنے رعب کو قائم رکھتے ئے پوچھا۔

"اس لیے پوچھتا ہوں کہ وہ تمہیں دُھتکار چکی تھی۔" میں نے کہا ـــ ، وقوف کے بچّے! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ اب بھی تمہیں ، نہیں کر رہی۔ اب بھی اُس کی زبان پر حسنین کا نام ہے۔" میں اُس کے ے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"کیا اُس نے آپ کے ساتھ یہ باتیں کی ہیں؟" اس نے احمقوں کی طرح پوچھا۔

"اُس نے اور بھی بہت سی باتیں کی ہیں" ـــ میں نے کہا۔ "تم نے ہا نہیں کہ وہ میرے ساتھ باہر گئی تھی؟ وہ مجھے جگہ بھی دکھا لائی ہے۔"

"کون سی جگہ؟" اس نے ہچکی لینے کے انداز سے پوچھا۔

"جہاں اس کی انگوٹھی گری تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "تم نے دیکھا

نہیں یہاں سے ستارا بھی ابھی گیا ہے؟" اُس کی زبان بند ہو گئی اور آنکھیں ٹھہر گئیں۔ مجھے ایسے ہی ردِعمل کی توقع تھی۔ میں نے پوچھا۔۔۔ "تم نے دوسری انگوٹھی کیوں خریدی تھی؟"

"پہلی کُھلی تھی۔" اُس کے منہ سے جیسے یہ الفاظ پھسل کر باہر آ گئے ہوں۔ "کام کرتے گر پڑتی تھی۔"

"تمہیں کس نے بتایا تھا؟" میں نے پوچھا۔۔۔ "تمہاری ماں نے؟۔۔۔۔ جواب دو۔ میں دو سیکنڈ میں ثابت کر دوں گا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔" وہ نیم مدہوش رہا۔ "ستار سے تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم نے دوسری انگوٹھی خریدی تھی؟۔۔۔۔ کہہ دو پہلی انگوٹھی کُھلی تھی اس لیے تبدیل کرائی تھی۔ کہہ دو وہ گُم نہیں ہوئی تھی۔" اُس کی دلیری اور مردانگی ختم ہو چکی تھی۔ آنکھیں پھاڑے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے کہا۔۔۔ "تمہیں فاطی نے بتایا تھا کہ انگوٹھی گُم ہو گئی ہے۔ اُسے شک تھا کہ وہ اس جگہ گری ہے جہاں رات کو تم گئے تھے اور جہاں حسین بھی تھا۔" اُس پر تو جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ مجھے چونکہ ابھی بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا اس لیے میں نے ہوا میں تیر چلانے مناسب نہ سمجھے۔ میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر عبدو کو اُس کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے دوسرے دروازے سے پچھلے برآمدے میں لے جاؤ اور دیوار کے ساتھ منہ دیوار کی طرف کر کے بٹھا دو اور خود اس پر پہرہ دو۔

میں نے فاطی کی ماں کو بلایا۔ اُسے اپنے سامنے بٹھایا ہی تھا کہ اُس کا خاوند اندر آ گیا۔ کہنے لگا۔۔۔ "یہ سیدھی اور شریف سی عورت ہے۔

آپ کے کسی سوال کا جواب ٹھیک طرح نہ دے سکے گی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے پاس بیٹھ جاؤں۔"

"دیکھو میاں!" میں نے اُسے کہا۔۔۔ "تم اس کمرے سے نہیں، اس ڈاک بنگلے کے احاطے سے باہر نکل جاؤ۔ فوراً۔۔۔ چلو۔۔۔ نکلو یہاں سے۔"

اُس نے ذرا سی پس و پیش کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اُسے ڈانٹ کر باہر نکال دیا۔ مجھے بتایا جا چکا تھا کہ یہ اس عورت کا دوسرا خاوند ہے اور یہ عورت پہلے خاوند کے گھر بھی مظلوم رہی اور دوسرا خاوند بھی اس پر ظلم کر رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا۔۔۔ "میری بات غور سے سنو بہن! تم اس وقت پولیس کی حفاظت میں ہو۔ میں جانتا ہوں تمہاری زندگی کس طرح گزری ہے۔ میں تم سے جو پوچھوں سچ بتانا۔ میں تمہاری حفاظت کا پورا بندوبست کر کے جاؤں گا۔"

پہلے اُس کے آنسو نکلے پھر وہ ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اُسے بہلانے کی کوشش نہ کی۔ اُس نے منہ پر دوپٹہ ڈال لیا۔ کچھ دیر بعد جب اُس کی ہچکیاں ذرا رُکنے لگیں تو میں نے اٹھ کر اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کا چہرہ دوسرے ہاتھ سے اوپر اٹھا کر کہا۔۔۔ "مجھے بھائی نہیں سمجھو گی؟ تمہارا خاوند بدکار انسان ہے، اسی لیے میں نے اُسے دُھتکار کر باہر نکال دیا ہے۔ تم دکھی ہو، اور مظلوم ہو، اس لیے تمہیں بہن کہہ رہا ہوں۔" مجھے آج سارے الفاظ یاد نہیں رہے جو میں نے اُسے کہے تھے۔ اُس زمانے میں جب میرا جسم خون سے بھرا ہوا تھا، میں بڑے اچھے اچھے الفاظ بول لیا کرتا تھا

اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے پتھر کو بھی موم کر لیا کرتا تھا۔ یہ عورت تو بے چاری مظلوم تھی۔ اتنی اچھی صورت پر غم کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کی ہمدردی میں الفاظ میرے دل سے نکل رہے تھے۔ میں نے ان کا اثر دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پیار اور ہمدردی کے دو لفظوں کے لیے ترس رہی تھی۔

اُس نے کہا۔ "اب میرا کوئی کیا بگاڑے گا۔ میں تو کہتی ہوں کہ میرا خاوند مجھے زہر دے دے، میں خوشی سے پی لوں گی یا آپ مجھے پھانسی کے تختے کھڑا کر دیں، اپنے ہاتھوں رسہ گلے میں ڈالوں گی۔" اُس نے اور بھی بہت سی باتیں کیں جو سنانا ضروری نہیں۔ ایک جملہ میرے دل میں اتر گیا۔ اُس نے کہا۔ "پہلے خاوند نے اس لیے مجھ پر ظلم کیا کہ میں نے لڑکی کو جنم دیا تھا دوسرا خاوند اس لیے ظلم کر رہا ہے کہ لڑکی جوان اور خوبصورت ہے اور میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔" میں نے اُسے کہا کہ وہ تمہاری بیٹی ہے، تم اسے منع نہیں کر سکتیں؟ اُس نے جواب دیا۔ "یہ میری بیٹی نہیں سوت (سوکن) ہے۔ میں تو گھر میں نوکرانی ہوں۔ وہ اسے شراب بھی پلاتا ہے۔ وہ اس کا سگا باپ تو نہیں۔ سوتیلے باپ کبھی سگے ہوئے ہیں؟"

اُس نے لمبی لمبی تفصیلات سنائیں۔ میں نے پہلے بھی ایسے سوتیلے باپ دیکھے تھے۔ میرے لیے یہ قصہ نیا نہیں تھا۔ میں آپ کو صرف واردات اور تفتیش کی تفصیل سناؤں گا۔ میں نے اُسے قتل کی رات یاد کرا کے پوچھا کہ اُس رات فاطی باہر نکلی تھی؟ اُس نے جواب دیا۔ "میں کمرے میں قیدیوں کی طرح

پڑی رہتی ہوں۔ مجھے کیا خبر وہ گھر میں تھی یا کہیں چلی گئی تھی۔"

"تمہارا خاوند اُس رات گھر تھا؟"

"نہیں۔" اُس نے ذرا سوچ کر کہا۔ "وہ شرابی شہر گیا ہوا تھا.... ہندوؤں کے ساتھ۔" اُس نے ذہن پر اور زور دیا اور کہا۔ "ہاں، فاطی کو میں نے باہر جاتے دیکھا تھا، پوچھا نہیں تھا کہ کہاں جا رہی ہے۔"

"واپس کب آئی تھی؟"

"میں سو گئی تھی۔" اُس نے کہا اور جھنجھلا کر کہنے لگی۔ "میں تو پتھر ہوں۔ مجھ سے آپ ان دونوں کے متعلق کچھ نہ پوچھیں۔"

میں اُس سے فاطی کے کپڑوں کے متعلق پوچھنا چاہتا تھا جو اُس نے رات کو پہن رکھے تھے۔ مجھے شک یہ تھا کہ وہ قتل میں شریک تھی تو لاش ٹرنک میں رکھنے میں اس نے قاتل کی مدد کی ہوگی۔ اس کے کپڑے خون آلود ضرور ہوئے ہوں گے۔ فاطی کی ماں سے میں نے بہت سے سوال کیے تو وہ صرف یہ بتا سکی کہ صبح فاطی کے جسم پر وہ کپڑے نہیں تھے جو اُس نے گزشتہ رات پہنے ہوئے تھے۔ میرے سوال کے جواب میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ اُس نے صبح سویرے غسل کیا تھا اور رات والے کپڑے دھوئے تھے۔ ماں کے بیان کے مطابق گھر کے تمام کپڑے ایک عورت آ کر دھو جایا کرتی تھی۔ فاطی نے اپنے کپڑے پہلے کبھی نہیں دھوئے تھے..... اس عورت نے میرا کام اور زیادہ آسان کر دیا لیکن اُس کے منہ سے یہ باتیں نکلوانے کے لیے مجھے بے پناہ کوشش کرنی پڑی، حالانکہ وہ باتیں چھپانے کی ذرہ بھر کوشش نہیں کر رہی تھی۔

وہ دراصل دماغی طور پر بہت سست عورت تھی۔ کبھی تو یہ شک ہوتا تھا کہ اس کا دماغ سو گیا ہے۔ مجھے بیدار کرنا پڑتا تھا۔ یہ شاید اس بُرے سلوک کا اثر تھا جو اسے دو خاوندوں سے ملا تھا۔

ماں نے پردے چاک کر ڈالے

اُسے باہر بھیج کر میں نے عبدو کی ماں کو بلایا۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ”میرا بیٹا کہاں ہے؟“ اس نے عبدو کو اندر آتے دیکھا، باہر جاتے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے پچھلے برآمدے میں بٹھا رکھا تھا۔ اُس کی ماں کو میں نے تسلّی دلاسے دیئے اور بتایا کہ اسے گرفتار یا قید نہیں کیا گیا۔ اس عورت کے ساتھ بھی مجھے بہت مشکل پیش آئی۔ اُسے اپنے بیٹے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ بار بار کہتی تھی ”میرا بیٹا کہاں ہے؟ آپ نے پکڑ تو نہیں لیا؟“ میں نے اس کی اسی کمزوری کو استعمال کیا۔ اُسے جھوٹی تسلیاں دے کر اور طرح طرح کی فریب کارانہ باتیں کر کے اسے قائل کر لیا کہ وہ میرے ہر ایک سوال کا جواب صحیح دے دی گی تو اس کا بیٹا محفوظ رہے گا ورنہ اسے انگریز ہتھکڑیاں لگا کر لے جائیں گے اور بے گناہ کالا پانی بھیج دیں گے۔“ ممتا کی ماری ہوئی اور لاڈ سے بگاڑے ہوئے اکلوتے بیٹے کے لیے پریشان عورت نے مجھے سب کچھ بتا دیا جو اُسے معلوم تھا۔ مختصر یہ کہ عبدو ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ دس سال کا تھا جب

باپ مر گیا۔ گھر میں دانے تھے جن کی بدولت بچے کو شہزادہ بنایا گیا، سیدھی ضد پوری کی گئی جس سے وہ ضدی ہو گیا۔

دس سال تک وہ بگڑ چکا تھا۔ باپ مر گیا تو ماں نے بچے کی خاطر دوسری شادی نہ کی۔ زندگی بچّے کے لیے وقف کر دی۔ زمین بہت تھی۔ تیرہ چودہ سال کی عمر تک بچہ آوارہ ہو چکا تھا۔ دودھ، مکھن اور گھی نے اسے چودہ سال کی عمر میں چوبیس سال کا جوان بنا دیا۔ شہر قریب تھا۔ جہاں وہ پیسہ ضائع کرنے لگا۔ جوان ہوا تو خوبرو، دلیر اور مرنے مارنے کے لیے سدا تیار نکلا۔ کوئی اس کے منہ نہیں آتا تھا۔ اُس نے چند مہینوں سے ماں کو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے لیے فاطی کا رشتہ مانگے۔

ماں اس لڑکی کو گھر نہیں لانا چاہتی تھی کیوں کہ اُسے وہ بدچلن سمجھتی تھی۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ فاطی کی بدچلنی کس طرح تھی اور کس کے ساتھ تھی۔ اُس نے کہا وہ بہت ہی منہ پھٹ، چلبلی اور بے حیا لڑکی تھی۔ مقتول کے متعلق اس نے کہا کہ لوگ کہتے تھے کہ اس کے ساتھ لڑکی کے تعلقات ٹھیک نہیں تھے۔ ماں کی رائے یہ تھی کہ اس بدمعاش لڑکی نے اُس کے بیٹے کو بھی اپنے جال میں پھانس لیا تھا۔ وہ بیٹے کی یہ ضد پوری کرنے کی بجائے خودکشی کے لیے تیار تھی مگر بیٹا کہتا تھا کہ اس لڑکی کا رشتہ کوئی اور لے گیا تو میں گھر سے چلا جاؤں گا یا خودکشی کر لوں گا۔

ماں اپنے بیٹے کے ہاتھوں مجبور ہو گئی۔ اسے بہت سمجھایا۔ یہ بھی کہا کہ

فاطی کا سوتیلا باپ بہت ہی بدنام آدمی ہے، مگر بیٹے کی ضد کے آگے مامتا جھک گئی۔ اس نے فاطی کی ماں سے رشتے کی بات کی تو وہ فوراً مان گئی لیکن یہ بھی کہا کہ اس کے خاوند سے وہ خود بات کرے۔ ماں نے فاطی کے سوتیلے باپ سے بات کی تو اُس نے بھی ہاں کر دی۔ اس سے عبدو کی ماں کو یہ افسوس ہُوا کہ فاطی کے ماں باپ نے خدا کا شکر ادا کیا ہے کہ کسی نے فاطی کا رشتہ مانگا ہے۔ ماں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ گاؤں کا کوئی گھر اس لڑکی کا رشتہ لینے پر آمادہ نہیں تھا۔ رشتہ طے ہو گیا پھر منگنی ہوئی۔ ماں نے بیٹے کے ساتھ جا کر پہلے منگنی کی انگوٹھی خریدی جو اُس نے لڑکی کو پہنائی تھی .... یہاں میں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا —

"عبدو نے مجھے بتایا ہے کہ انگوٹھی ذرا کھُلی تھی"— ماں نے اس کی تائید کی اور کہا —"لڑکی نے کہا تھا کہ انگوٹھی کھلی ہے۔ کام کرتے گرنے کا ڈر ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ شادی کے بعد دوسری بنوا دیں گے یا یہ تبدیل کروا لیں گے۔"

"انگوٹھی اُسی وقت بدلوا لیتے"۔ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا —"کہیں ایسا نہ ہو کہ گر کر گم ہی ہو جائے۔"

"نہیں" ماں نے کہا —"لڑکی ہوشیار ہے۔ اُس نے اتار کر رکھ لی ہو گی۔ سونا کون گم کرتا ہے۔"

اس جواب سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ماں کو انگوٹھی کے گم ہونے کا علم نہیں اور اُسے یہ بھی علم نہیں کہ اس کا بیٹا فاطی کو دوسری انگوٹھی

ردید کر دے چکا ہے۔ میں نے اور بہت سے غیر اہم سے سوال کر کے اُسے ل کی رات بتائی اور پوچھا —"اُس رات عبدو کہاں گیا تھا؟ تمہیں کچھ ا کر گیا ہو گا؟"

"مجھے تو وہ کبھی بھی بتا کر نہیں جاتا" اس نے جواب دیا —"اس ات بھی مجھے بتائے بغیر نکل گیا تھا" اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر وچھا —"تجھے اللہ کی قسم ہے داروغہ بیٹے! حسین کے قتل کے ساتھ تو اس کا تعلق نہیں ہے؟"— میں نے ہنس کر اُسے تسلّی دی کہ نہیں، عبدو بے چارہ کسی کو کیا قتل کرے گا۔ میں نے اُسے دیکھا ہے۔ وہ تو بھولا بادشاہ ہے۔ ماں فوراً مان گئی اور اُس نے مجھے بہت سی دعائیں دے ڈالیں۔

"مجھے معلوم ہے وہ اُس رات نکل گیا تھا" میں نے کہا اور پوچھا — "وہ برچھی گھر سے لے گیا تھا؟"

"ہاں جی!" ماں نے کہا —"اُس کی برچھی بڑی خوبصورت ہے"

"اُس کا پھل تین دھارا ہے" میں نے بے پروائی سے کہا —"جوان آدمی کے ہاتھ میں برچھی اچھی لگتی ہے"— ابتدا میں تو اس عورت نے مجھے پریشان کیا تھا لیکن اسے میری زبان کا کمال کہہ لیں یا ماں کے پیار کی انتہا کہ اُس پر میرا جادو چل گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں بیٹے کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا —"وہ واپس بہت دیر سے آیا ہو گا"

"بہت دیر سے آیا تھا" ماں نے جواب دیا۔

"تم نے اس کے کپڑے دیکھے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!" ماں نے کہا — "بھیگے ہوئے تھے۔ کہتا تھا چھپڑ میں گر پڑا تھا۔"

صاف ظاہر تھا کہ اُس نے خون سے لتھڑے ہوئے کپڑے چھپڑ یا ندی میں دھوئے اور نچوڑ کر پہن لیے تھے۔ میں نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں تفتیش نہیں کر رہا اور مجھے اس کے بیٹے کے ساتھ دلچسپی ہے، میں نے کہا — "اتنی ٹھنڈ میں بے چارہ پانی میں گر پڑا تھا۔ اُسے گرم دودھ پلا دینا تھا" — مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ یہ عورت مجھے راز کی ایک اور بات بتا دے گی۔

"وہ رُکا نہیں،" ماں نے کہا — "برچھی اندر رکھ کر اس نے کپڑے بدلے اور پھر باہر نکل گیا تھا۔"

"پھر کب واپس آیا تھا؟"

"بہت دیر بعد۔"

اس کے بعد ماں نے کام کی کوئی اور بات نہ بتائی۔ مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ ٹرنک کہاں سے آیا تھا۔ ٹرنک ریسٹ ہاؤس میں رکھا تھا۔ میں نے اس عورت کو یہ ٹرنک دکھا کر پوچھا — "اچھی طرح دیکھو.... یہ ٹرنک تمہارے گھر کا تو نہیں؟" — میں نے دیکھا کہ وہ پہلے چونکی۔ اُسے یاد آ گیا ہو گا کہ حسین کی لاش ٹرنک سے برآمد ہوئی تھی۔ یہ تو سارے گاؤں کو پتہ چل گیا تھا۔ اُس نے میری طرف دیکھا تو اُس کے چہرے

کا تاثر بدلا ہوا تھا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا — "حسین کی لاش اس ٹرنک سے نکلی تھی؟"

"تم لاش کو بھول جاؤ نا!" میں نے پیار سے کہا — "اس ٹرنک کو پہچانو۔ تمہارا لاش کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے۔"

"نہیں داروغہ بیٹے!" وہ میرے سامنے دوزانو بیٹھ گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی — "میرا بیٹا حسین کا قاتل نہیں۔ وہ تو عبدو کا دوست تھا۔ لڑکے بالے اکٹھے کھیلتے تھے۔" اُس کے آنسو بہنے لگے۔ میں نے اسے سنبھالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ بے قابو ہو چکی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں اس سے بھید لے رہا ہوں۔ میں جان گیا کہ یہ ٹرنک اسی کے گھر سے گیا ہے ورنہ اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

میرے ذہن میں ایک بات آ گئی۔ میں نے کہا — "اس ٹرنک میں لاش عبدو نے نہیں ڈالی تھی۔ تمہارے گھر سے یہ ٹرنک چوری ہوا ہے۔ قاتل نے اس میں لاش ڈالنے کے لیے تمہارے گھر سے اٹھوایا ہے۔ میں نے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔"

"میں کیوں نہ گھبراؤں۔" اس نے ہاتھ ملتے ہوئے اور روتے ہوئے کہا — "یہ ٹرنک تو عبدو خود لے کر گیا تھا۔"

مختصر یہ کہ گھنٹے بھر کی بچ بچ کے بعد یہ راز کھلا کہ عبدو جب بھیگے ہوئے کپڑے اتار کر اور برچھی رکھ کر پھر باہر نکلا تھا تو وہ یہ ٹرنک اٹھا کے لے گیا تھا۔ ٹرنک پرانا تھا۔ ایک کوٹھڑی میں پڑا تھا۔ اُسی دن کی بات

ہے کہ عبدو نے ماں سے کہا تھا کہ وہ یہ ٹرنک مرمت کرا کے اسے روغن کرائے گا۔ ماں یہ سمجھتی رہی کہ وہ ٹرنک کسی کو مرمّت کے لیے دینے گیا ہے لیکن ماں نے یہ نہ سوچا کہ اتنی رات گئے گاؤں میں ٹرنک کون مرمّت کرے گا۔ عبدو بے شک ایک خونخوار قبیلے کا فرد تھا جس میں قتل کوئی بڑی واردات نہیں سمجھی جاتی تھی لیکن وہ عادی قاتل نہیں تھا۔ انسان انسان کا خون کر کے نیم پاگل ہو جاتا ہے۔ عبدو کے دماغ کی حالت یہی ہو گئی تھی۔ اسی حالت میں اُس نے ماں کے سامنے ٹرنک اٹھایا اور باہر نکل گیا۔ اُس کے دماغ نے اتنا سا بھی ساتھ نہ دیا کہ اس کی ماں کے منہ سے بات نکل سکتی ہے۔ وہ میں نے نکلوالی۔

لڑکی حوالات میں

ماں کو باہر بھیج کر میں نے فاطی کو بلایا اور اُسے کہا۔ "تم اب گھر نہیں جا سکو گی، حوالات میں جاؤ گی۔"

اُس نے آہستہ سے کہا۔ "کیوں؟"

میں نے جواب دیا۔ "کیونکہ تم نے عبدو کے ساتھ مل کر حسین کو قتل کیا اور اُس کی لاش ٹرنک میں بند کی ہے۔"

وہ سر سے پاؤں تک اس طرح کانپی جیسے کسی نے اس کے جسم کے ساتھ بجلی کے ننگے تار لگا دیے ہوں۔ ہر ملزم کی طرح اس نے انکار کیا،

ہا۔ "یہ سب بدمعاشی میری ماں کی ہے۔ وہ مجھ سے بدلہ لے رہی ہے۔ کو ایسے نہیں کرنا چاہیئے۔"

"کیسا بدلہ؟" میں نے پوچھا۔ "تم نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟"

وہ جھجھک گئی۔ میں نے اُسے بٹھا لیا اور پیار سے کہا۔ "گھبراؤ یں۔ کوئی قیامت نہیں آ گئی۔" لیکن اس کی گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ میں ایک بار پھر پوچھا۔ "ماں تم سے کس گناہ کا بدلہ لینا چاہتی ہے؟"

"وہ مجھ سے جلتی ہے۔" اُس نے جواب دیا۔ "ابو مجھ سے پیار تے ہیں۔ ماں کہتی ہے کہ تم انہیں باپ نہیں سمجھتی" — میں اُس کی وصلہ افزائی کرتا رہا۔ وہ اپنی صفائی میں بولتی رہی۔ میں نے آہستہ آہستہ ں کے دماغ پر قبضہ کر لیا۔

"سنو لڑکی!" میں نے اُسے کہا۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ سے باپ سمجھتی ہو یا نہیں یا وہ تمہیں بیٹی سمجھتا ہے یا نہیں۔ وہ تمہارا ا دین ایمان ہے۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تمہاری پہلی انگوٹھی ے پاس ہے۔ باہر دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ انگوٹھی انہیں اس جگہ لی تھی جہاں عبدو نے حسین کو قتل کیا تھا۔ تم وہاں موجود تھیں۔ ح کے وقت تم نے اپنے کپڑے خود دھوئے تھے۔ کیوں؟ .... مجھے ہ دو میں جھوٹ بول رہا ہوں، میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

اُس نے انکار نہ کیا لیکن اقرار بھی نہ کیا۔ وہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔ ں بھی سوچ میں پڑ گیا۔ میرے سامنے سوال یہ آ رہا تھا کہ یہ لڑکی مقتول

کو چاہتی تھی، اس لیے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اُس نے اُسے قتل ک
ہو۔ ہُوا یہی ہے کہ عبدو اس کا منگیتر ہے۔ اس نے لڑکی کو حسین
کے ساتھ دیکھ لیا اور حسین کو قتل کر دیا۔ لڑکی نے حسین کو بچانے ک
کوشش کی جس میں اس کے کپڑوں پر خون پڑا۔ یہ کپڑے اس نے
خود دھوئے۔ میں لڑکی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے اصل و
معلوم نہیں۔ میں نے اسے کہا — "زیادہ نہ سوچو فاطی! میں تمہاری
کروں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ قتل تم نے نہیں کیا۔ مقتول کو برچھیاں عب
نے ماری ہیں۔ تم وہاں صرف موجود تھیں۔ مجھے تمام واقعہ کا علم ہے۔ ا
خود مجھے سنا دو گی تو تمہاری بچت کی صورت پیدا کر دوں گا، ورنہ یو
ہوگا کہ تمام گواہ عدالت میں بیان دیں گے تو عدالت تمہیں چھوڑے
نہیں۔ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے کہ تمہیں بچانے کے لیے جس ک
کو چاہوں توڑ دوں.... بولو۔ ہر ایک بات مجھے سنا دو۔"

وہ کتنی ہی دلیر اور بے حیا کیوں نہ ہوتی، اتنے بڑے جرم کا اقبا
کرنا آسان نہیں۔ وہ آخر لڑکی تھی۔ عورت ذات تھی۔ اُس نے بولنے
کوشش کی تو اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ وہ اقبالِ جرم سے انکا
کر رہی تھی۔

"عبدو کہاں ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "اُس نے آپ کو کچھ بتایا ہے؟"

"مجھے اس سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔" میں نے کہا — "جب
کوئی انسان کسی انسان کو رات کے وقت چھپ کر قتل کرتا ہے تو آسمان

ستارے گواہی دیا کرتے ہیں۔ مجھے ستاروں کی گواہی مل گئی ہے۔"

"میں نے حسین کو قتل نہیں کیا۔" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

اُس نے دو تین ایسی باتیں کہیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر عبدو
وف سوار ہے یا ابھی اس میں اتنی دلیری باقی ہے کہ پولیس سے اور سزا
نہیں ڈرتی۔ میں ریسٹ ہاؤس کے صاف ستھرے اور سجے ہوئے کمرے
تفتیش کر رہا تھا جہاں انگریز افسر قیام کیا کرتے تھے۔ اس کمرے کا اثر
ا نہیں تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر فاطی کو اُس کے حوالے کیا اور
کہ اسے تھانے لے جاؤ اور حوالات میں بند کر دو۔ تب وہ تڑپی اور
تھ پاؤں مارنے لگی۔ اسے ہیڈ کانسٹیبل نے گھسیٹ کر باہر نکالا اور
یل کر ریسٹ ہاؤس سے باہر لے گیا۔ اس کا سوتیلا باپ دوڑ کر اندر
اور مجھ سے پوچھا — "اُسے کہاں بھیج رہے ہو؟" میں نے جواب
— "جہاں وہ عمر کے چودہ سال گزارے گی۔"

"اس کا قتل کے ساتھ کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تم بھی اس کے ساتھ جانا چاہتے ہو؟"

تھوڑی سی بحث کے بعد وہ موم ہو گیا اور ادھر اُدھر دیکھ کر بولا —
آپ کی منہ مانگی خدمت کروں گا۔ میری عزت بچائیں۔ میں عزت دار
ہوں۔ اپنے منہ سے کہیے۔ میں ابھی قدموں میں رکھ دوں گا۔"

میں نے اُسے باہر نکال دیا۔ وہ دوڑتا ہُوا ریسٹ ہاؤس کے احاطے
باہر گیا۔ میں نے عبدو کو بلایا۔ اُس کے ساتھ کوئی اور بات نہ کی۔ صرف یہ کہا۔

کہا۔" اقبالی بیان دو گے یا عدالت میں اپنے خلاف گواہوں سے با
سنو گے؟" اس نے جواب دیا۔" میں نے کیا جرم کیا ہے؟"

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا۔ اُسے کان میں کہا کہ اسے تھانے لے جاکر حوالات میں بند کردو اور اسے زنانہ حوالات کے سامنے سے گزارنا تاکہ یہ دیکھ لے کہ فاطی بھی قید ہو چکی ہے۔ کانسٹیبل اُسے لے گیا اور میں یہ سوچنے بیٹھ گیا کہ مجھے کس قسم کی شہادت اور کیسے کیسے ثبوت کی ضرورت ہے۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ فاطی اور عبدو اقبالی بیان دیں گے۔ اگر دے بھی دیتے تو بھی ثبوت کی ضرورت تھی۔ آلہ قتل اور واردات کے وقت کے کپڑے برآمد کرنے تھے۔

میں اسی سوچ میں غرق تھا اور مسلسل کام کرنے سے دماغ بو
جا رہا تھا۔ میں نے ذرا اونگھنے کا ارادہ کیا تو کنور دیوان سنگھ آگیا۔
تو اُس نے مبارک باد دی کہ میں نے اتنی جلدی ملزم پکڑ لیے ہیں۔ آدمی چا
تھا۔ مجھے موڈ میں لاکر اُس نے فاطی کی وکالت شروع کر دی۔ پھر اس
سوتیلے باپ کو بہت ہی باعزت انسان ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں
اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ رشوت لینا اور مجھے حصہ دینا چاہتا تھا۔ اس
کی نظر لڑکی پر بھی تھی۔ اُس نے بڑے اچھے انداز سے مجھے ایم۔ بی۔ ڈُ
کی دوستی کا بھی رعب دیا۔ میں نے اسے کہا کہ مجھے تفتیش مکمل کر لینے
اور یہ بھی یاد رکھو کہ ایم۔ بی۔ ڈُوڈ کے اوپر بھی کوئی افسر ہے اور اُس
اوپر خدا کی ذات بھی ہے۔ اگر اس کا ڈر نہ ہوتا تو میں تمہاری بات ما

لیتا۔ کچھ دیر وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے اُس کی باتوں سے محسوس کیا کہ وہ کیس کو خراب کرنے کی کوشش کرے گا۔ میں نے اُسے کہہ دیا کہ کہیں میں دخل دینے کی کوشش نہ کرنا۔ اگر تم نے ملزموں کو پٹی پڑھائی کہ اقبال جرم نہ کریں تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میری تفتیش مکمل ہے۔ مجھے اقبالی بیان کی ضرورت ہی نہیں۔

وہ ہنسی مذاق کرتا چلا تو گیا لیکن میں نے یہ خطرہ محسوس کر لیا کہ یہ ہندو گڑبڑ کرے گا۔ یہ علاقہ اس کا تھا۔ وہ گواہوں کو توڑ سکتا تھا۔

لڑکی کی کہانی، باپ کا گناہ

میں رات دو بجے کے بعد تھانے گیا۔ تینوں ڈوم وہیں بند تھے۔ مجھے دیکھ کر بلبلا اٹھے۔ وہ تو بے گناہ رگڑے جا رہے تھے۔ اُن کی نجات کا وقت آگیا تھا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتا دیا کہ مجرم پکڑے گئے ہیں۔ اُن سے فارغ ہو کر فاطی کو حوالات سے نکالا اور تفتیش کے کمرے میں لے گیا۔ یہ بہت غلیظ کمرہ تھا۔ میں نے لڑکی سے پوچھا۔" تم نے کیا سوچا ہے؟ اپنی زبانی ساری کہانی سناؤ گی؟"

اس کا دم ٹوٹ چکا تھا۔ تھانے، پولیس، حوالات اور جرم کی دہشت معمولی نہیں ہوتی۔ اتفاقیہ جرم کرنے والے اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ کمزور سی لڑکی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اُس نے کنور

دیوان سنگھ کے متعلق کہا ـــ "یہ دارو غہ کہتے ہیں کہ آپ کو کوئی بات نہ بتاؤں، آپ کہتے ہیں ساری بات بتا دو۔" میں نے اُسے بتایا کہ یہاں کا دارو غہ ہندو ہے۔ وہ تمہیں مسلمان لڑکی جان کر جیل خانے بھجوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ مجھے ساری بات بتا دو گی تو فائدے میں رہو گی.... میں اس کی اُس وقت کی ذہنی حالت سمجھتا تھا۔ یہ مجرم کی بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ میں نے رعب اور تشدد کی بجائے پیار اور ہمدردی کا حربہ استعمال کیا اور جن باتوں کا مجھے علم ہو چکا تھا وہ اشاروں اشاروں میں اُسے بتاتا رہا۔ ان اشاروں کا اثر گہرا تھا۔ اُسے یہ پتہ چل گیا کہ میں واردات سے پوری طرح واقف ہوں، حالانکہ میں پوری طرح واقف نہیں تھا۔

"قتل میں نے نہیں کیا۔" اُس کے منہ سے ایسے نکل گیا جیسے وہ خواب میں بڑبڑا رہی ہو۔

"کس نے کیا ہے؟"

"عبدو نے۔"

"اُس نے تمہیں حسین کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔"

"نہیں۔" اُس نے کہا۔ "میں حسین کو عبدو کے ہاتھوں مروانا چاہتی تھی۔ اسے میں نے مروایا ہے۔"

میں اتنا مضبوط آدمی تھا مگر یہ سن کر کانپ گیا۔ اس لڑکی نے اُس آدمی کو جسے وہ چاہتی تھی اُس آدمی سے مروایا جسے وہ پسند ہی نہیں کرتی تھی۔

میں نے اپنے مخصوص انداز سے اس کے ذہن اور دل سے سزا کا خوف اتار دیا اور ہمدردانہ باتوں سے اُسے آزادی سے ہر بات اگلنے کے لیے دلیر بنا دیا۔ وہ جوں جوں بولتی گئی اُس کے چہرے پر سکون اور اطمینان آتا گیا۔ یہ لڑکی ایک نفسیاتی کیس تھا۔ جن حالات نے اسے نفسیاتی مریض بنایا تھا وہ تفصیل سے سنانا ضروری ہیں۔ اس کی اقبالی کہانی یوں ہے:

اس نے اپنے باپ کے گھر میں ہوش سنبھالا تو اس نے محسوس کیا کہ باپ اس کا دشمن ہے۔ کچھ پیار ملا تو صرف ماں سے ملا۔ باپ نے اسے گھر میں قبول ہی نہیں کیا۔ اس نے بھول کر بھی پیار نہ کیا۔ وہ جب اچھی بُری باتیں سمجھنے کے قابل ہوگئی تو اس کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے کہ لڑکی بدقسمتی اور نحوست کی نشانی ہوتی ہے۔ فاطی کی ماں کو اس کا باپ کبھی کبھی اس لیے مار پیٹ ڈالتا تھا کہ اس نے اس کے لیے بیٹا پیدا نہیں کیا۔ لڑکی باپ کے اس ظالمانہ سلوک میں چھ سات سال کی ہوگئی تو اُس کا بھائی پیدا ہُوا۔ باپ بچے کے ساتھ پیار کرنے لگا لیکن بچے کی ماں کے ساتھ اور بچی کے ساتھ اُس کا رویہ وہی رہا۔ بچی جب باپ کو دیکھتی تھی کہ اُس کے پاس تو بہت سارا پیار ہے لیکن وہ صرف بچے کو دے رہا ہے تو اس کے دل پر چوٹیں پڑتی تھیں۔ بچی کا ذہن ایک اور وجہ سے بھی خراب ہُوا۔ وہ باہر نکلتی اور کھیلتی تھی تو کوئی نہ کوئی عورت یا مرد یہ کہتا ہوا گزر جاتا تھا کہ کتنی پیاری بچی ہے۔ کبھی کبھی کوئی اس کے سر پہ بھی ہاتھ پھیر جاتا تھا۔ گھر میں اس کے لیے پھٹکار تھی اور باہر پیار۔ وہ اور سیانی ہوئی تو اُسے سہیلیوں نے بھی

کہنا شروع کر دیا کہ وہ بہت پیاری ہے، بہت خوبصورت ہے۔

علم نفسیات کو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جس بچے کے ذہن پر دو متضاد اثرات پڑتے رہیں اس کی نفسیاتی حالت کیا ہوتی ہے۔ انسان کا بچہ پیار مانگتا ہے خواہ کہیں سے بھی ملے۔ جس بچے کے لیے پھٹکار اور دھتکار ہوتی ہے وہ پیار کا اور زیادہ پیاسا ہوتا ہے۔ فاطی بھی باہر پیار ڈھونڈنے لگی۔ اس کا باپ جاہل تھا جو اپنی بیٹی کے ساتھ نفرت کر کے یہ ثابت کر رہا تھا کہ وہ غیرت مند ہے مگر یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ اس کی بیٹی پیار کی تلاش میں کہاں کہاں ماری ماری پھر رہی ہے اور یہ پیاس اُسے کتنا بے غیرت بنا دے گی۔ یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ جن گھرانوں اور برادریوں میں لڑکیوں کو منحوس اور بے غیرتی کی نشانی سمجھا جاتا ہے ان کی لڑکیاں چال چلن کے لحاظ سے اچھی نہیں ہوتیں اور جن گھروں میں لڑکیوں کو لڑکوں کے برابر سمجھا جاتا اور انہیں پیار کا پورا حصہ دیا جاتا ہے وہ اپنے گھر کی عزت پر مٹتی ہیں۔

فاطی نے میرے کریدنے پر بتایا کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں اُس نے لڑکوں کے ساتھ پیار کا کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ میری رائے یہ ہے کہ اُس نے بدکاری کو ہی پیار سمجھ لیا تھا۔ اس عمر میں اس کا باپ مر گیا جس کا فاطی کو کوئی افسوس نہیں ہوا۔ اس کی بجائے خوشی ہوئی کہ اسے آزادی مل گئی۔ دو اڑھائی سال بعد اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی۔ اسی کے لگ بھگ اس کا دوستانہ حسنین (مقتول) سے ہو گیا تھا۔ سوتیلا باپ امیر اور شراب خور تھا۔ اُس نے فاطی کو بہت پیار دیا۔ اتنا پیار کہ اُس نے

سگے باپ کی نفرت کے زخم ٹھیک کر دیئے، مگر یہ پیار ایک بدکار، اور بے غیرت آدمی کا دھوکہ نکلا۔ فاطی جوان ہو چکی تھی۔ وہ سوتیلے باپ کی نیت بھانپ گئی لیکن اسے باپ ہی سمجھتی رہی۔ اس باپ نے اسے ریشمی کپڑے اور زیورات سے اندھا کرنا شروع کر دیا۔ آخر ایک رات لڑکی کو شربت میں شراب پلائی اور پھر اُن میں باپ بیٹی کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ باہر حسنین کے ساتھ اس کا تعلق بھی اسی قسم کا تھا۔ گھر میں پاکیزگی ختم اور باہر بھی ختم۔ اس کی ماں نے اپنے خاوند کو روکنے کی کوشش کی تو خاوند نے اُس کی پٹائی شروع کر دی۔ بیٹی سے کچھ کہا تو بیٹی نے اس کی بے عزتی کر دی۔

جہاں تک دل کا تعلق تھا فاطی کو حسنین اچھا لگتا تھا۔ وہ اس کا ہم عمر تھا۔ یہ بڑی ہی شدید محبت تھی مگر جسمانی۔ میرے بے شمار سوالوں کے جواب میں اس نے جو انکشاف کیے۔ ان سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ لڑکی حیوان بن چکی تھی۔ اس پر ہیجانی جذبات، پاگل پن یا مالیخولیا کی طرح غالب آچکے تھے۔ یہ بڑی ہی خطرناک کیفیت ہوتی ہے۔ میں نے حیوانیت کے بہت سے مجرم دیکھے ہیں۔ اگر آپ کو ان کی وارداتیں سناؤں تو آپ تسلیم نہیں کریں گے کہ کوئی انسان جسے خدا نے اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے، اتنا درندہ بھی ہو سکتا ہے۔ فاطی اس حد میں داخل ہو گئی تھی لیکن اس نے پیار اور تسکین کا ذریعہ حسنین کو بنایا اور کچھ کچھ سوتیلے باپ کو۔ کسی اور کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس سے اُلٹی سیدھی بات کرے۔ اس کی دلیری مشہور ہو گئی تھی اور منہ پھٹ ایسی کہ مرد اُسے دیکھ کر راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

عرف عبدو تھا جس نے اُسے دوستی کے لیے کہا۔ یہ نوجوان اپنے رنگ کا دلیر تھا۔ خوبرو بھی تھا، گاؤں میں اس کا رعب بھی تھا اور اُس کے گھر میں دانے اور پیسے بھی تھے۔ فاطی نے اُسے دھتکار کر دھمکی دی تو عبدو نے بھی دھمکی دی۔ یہ قصہ حسین کے قتل سے چار پانچ مہینے پہلے کا ہے۔ عبدو نے یہ دھمکی بھی دی کہ وہ حسین کو قتل کر کے اس کی لاش غائب کر دے گا۔ فاطی نے حسین کو بتایا۔ حسین نے عبدا کو چیلنج کیا۔ دو بار ان کی لڑائی بھی ہوئی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ فاطی نے عبدو کو قبول نہ کیا۔ عبدو اور حسین کی دشمنی پکی ہو گئی۔ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ حسین کی شادی چچا کی بیٹی کے ساتھ طے ہوئی تو فاطی نے اُسے شادی سے روکا۔ حسین نے اُسے بتایا کہ اس نے اپنی ماں سے بات کی تھی لیکن وہ نہیں مانی۔ باپ بھی نہیں مانتا کیونکہ چچا کی لڑکی کو باہر نہیں دیا جا سکتا۔ فاطی نے اُسے کہا کہ چلا کہیں بھاگ چلیں۔ حسین نے اسے کہا کہ بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ ان پڑھ دیہاتی اپنے گاؤں اور برادری میں ہی رہ سکتے ہیں مگر فاطی کی عقل پر حیوانیت سوار تھی۔

"میں جب سوچتی تھی کہ حسین کسی اور لڑکی کا ہو جائے گا تو میرا جسم سخت گرم ہو جاتا تھا" فاطی نے ان الفاظ میں اپنے اُس وقت کے جذبات بیان کیے "میری کھوپڑی میں کیڑے چلنے لگتے تھے اور میں پکا ارادہ کر لیتی تھی کہ اس لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی جو حسین کو اپنا خاوند کہے گی"

اس سے ذرا پہلے عبدو کی ماں نے فاطی کا رشتہ مانگ لیا جو اُسے دے دیا گیا۔ فاطی نے عبدو کو صاف کہہ دیا کہ وہ نکاح میں انکار کر دے گی اور اگر نکاح ہو گیا تو وہ ایسی ایسی حرکتیں کرے گی کہ وہ اُسے طلاق دے دے گا یا قتل کر کے پھانسی چڑھے گا اور اگر اُس نے طلاق نہ دی تو اُسے ساری عمر چین نہیں لینے دے گی۔ اس نے عبدو کو یہاں تک کہہ کہ وہ اُسے زہر دے کر مار ڈالے گی۔ ان دھمکیوں سے عبدو کی مردانگی جواب دے گئی۔ کسی مرد کی یہ بے عزتی اُسے خودکشی پر آمادہ کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے کہ نکاح کے وقت لڑکی اُسے قبول کرنے سے انکار کر دے۔ عبدو نے اس کی منت سماجت کی مگر فاطی نہ مانی۔

محبت اور موت کی آخری ملاقات

اتنے میں حسین کی شادی طے ہو گئی۔ فاطی کی اُس نے یہ بات نہ مانی کہ کہیں بھاگ چلیں۔ حسین کی شادی سے دو تین روز پہلے فاطی اس سے ملی اور رو رو کر اُسے منوانے کی کوشش کی کہ کہیں بھاگ چلیں۔ فاطی نے اس کی گردن دونوں ہاتھوں میں پکڑ لی جو حسین نے بڑی مشکل سے چھڑائی۔ حسین کو غصہ آ گیا۔ ان میں جھگڑا ہوا۔ حسین نے غصے میں اسے کہا کہ تم بے عزت لڑکی ہو۔ تمہاری خاطر میں اپنے چچا کی شریف بیٹی کو کیوں چھوڑ دوں۔ تم تو اُس کی بھی بیوی ہو جسے لوگ تمہارا باپ سمجھتے ہیں۔

فاطی یہ چوٹ برداشت نہ کرسکی۔ وہ عبدو سے ملی تو عبدو نے حسب معمول اس کی مِنّت کی کہ وہ اُسے قبول کرلے۔ فاطی پاگل ہوچکی تھی۔ اُس نے عبدو سے کہا کہ وہ اس شرط پر اُسے قبول کرے گی کہ وہ حسنین کو قتل کر کے لاش اس طرح غائب کردے کہ وہ پکڑا نہ جائے۔ فاطی نے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ ساری عمر اس کی غلام رہے گی۔

عبدو کے دل میں پہلے ہی حسنین کے خلاف عداوت بھری ہوئی تھی۔ فاطی کی محبت، دیہات کی جہالت اور قبیلے میں خون خرابے کی روایات نے عبدو کو فوراً تیار کرلیا اور حسنین کو قتل کرنے کی ایسی ترکیب سوچنے لگا جس میں وہ پکڑا نہ جاسکے۔ حسنین کی شادی ہوگئی۔ شادی کے بعد ایک بار فاطی نے حسنین کو اُس جگہ آنے کو کہا جہاں اُن کی ملاقاتیں ہُوا کرتی تھیں۔ حسنین آگیا۔ ان کی ملاقات کی جگہ یہی تھی جہاں حسنین قتل ہُوا۔ حسنین نے اُسے کہا کہ اب وہ اُسے نہیں ملا کرے گا۔ عبدو اُسے کسی بھی وقت قتل کرسکتا تھا، لیکن پکڑے جانے کے ڈر سے نہ کرسکا۔ دو مہینے گزر گئے۔ اس دوران حسنین اور فاطی کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ آخر عبدو کو یہ ترکیب پسند آئی کہ فاطی حسنین کو اسی جگہ بلائے، عبدو اُسے قتل کرے گا اور لاش ٹرنک میں بند کرکے رات کی گاڑی میں رکھ آئے گا۔ فاطی کے بیان کے مطابق وہ بہت خوش تھا کہ لاش دنیا کے دوسرے سرے تک جاپہنچے گی اور کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ یہ کس کی لاش ہے۔ عبدو نے کہا کہ وہ اُسے برچھی سے مارے گا۔ فاطی نے کہا کہ وہ اسے پکڑلے گی اور عبدو اس کا گلا دبا کر مار ڈالے گا۔ اس طرح خون نہیں نکلے گا، مگر عبدو اسے مردوں کی طرح مارنا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ تم اُسے پکڑو اور میں گلا دباؤں، یہ مردوں کا کام نہیں۔ لہٰذا برچھی سے قتل کا منصوبہ طے ہوگیا۔

قتل کے روز فاطی نے حسنین پر نظر رکھی۔ وہ اُسے گھر سے نکلتا نظر آیا تو فاطی نے اُسے روک کر بتایا کہ آج رات فلاں وقت آجانا، میں تمہارے پاؤں پکڑ کر معافی مانگوں گی، پھر تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گی۔ حسنین دھوکے میں آگیا۔ فاطی نے عبدو کو بتادیا۔ عبدو نے اُسے بتایا کہ ٹرنک تیار ہے.... فاطی کا سوتیلا باپ شام کے وقت اکثر شہر جایا کرتا تھا۔ فاطی نے اس سے معلوم کرلیا تھا۔ اُس شام اُسے شہر جانا تھا۔ وہ چلا گیا۔ ماں کے ساتھ تو فاطی کی بول چال پہلے ہی بند تھی۔ ماں جلدی سوگئی۔ فاطی نے سوتیلے باپ کی شراب کی بوتل نکالی اور اتنی پی لی جس سے اُس کے دل سے دنیا کا غم اور فکر نکل گیا۔ وہ کھیتوں میں گئی۔ پہلے اسے عبدو نظر آیا جو موقعۂ واردات کی طرف جارہا تھا۔ پھر اسے حسنین دکھائی دیا۔ وہ مقررہ جگہ کی طرف چل پڑی۔ گاؤں سے دُور جاکر وہ اکٹھے ہوئے۔ حسنین نے اُسے کہا— "آج کی ملاقات آخری سمجھو فاطی! میں بیوی کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔" فاطی نے جواب دیا— "قسم لے لو۔ آج آخری ملاقات ہوگی۔"

دونوں اس نشیبی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ فاطی اس سے ذرا ہٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی پہلی برچھی حسنین کی پیٹھ میں اُتر گئی۔ وہ اُٹھ کر پیچھے

کو مُڑا تو عبدو نے اُس کے پیٹ پر برچھی کے تین وار کیے۔ میرا خیال ہے کہ جو وار دل میں لگا اُس نے اُسے فوراً ختم کر دیا۔ وہ گر پڑا۔

فاطی نے عبدو سے پوچھا کہ ٹرنک کہاں ہے۔ اس نے بتایا کہ ٹرنک گھر ہے۔ وہ اس لیے ساتھ نہیں لایا تھا کہ ہو سکتا ہے حسین نہ آئے اس صورت میں ٹرنک لانا اور واپس لے جانا ٹھیک نہیں تھا۔

بہر حال یہ جرم حماقت اور جذبات کے زور پر کیا جا رہا تھا۔ پیشہ ور مجرموں کی طرح کوئی سکیم نہیں بنائی گئی تھی۔ عبدو ٹرنک لینے کے لیے چلا تو فاطی سے کہا کہ وہ قریب کہیں چھپی رہے تاکہ کوئی ادھر سے گزرتے لاش دیکھ لے تو پتہ چل جائے کہ وہ کون تھا۔ لڑکی کی دلیری دیکھیے کہ رات کے ذنت گاؤں سے دور اکیلی لاش کے پاس بیٹھی رہی۔

ہلکی ہلکی چاندنی تھی۔ عبدو کے کُرتے پر خون کے چھینٹے تھے۔ برچھی لمبی تھی۔ اس لیے برچھی پر چھینٹے زیادہ نہ پڑے۔ قریب ایک جھیڑ تھا۔ عبدو نے کُرتہ اتار کر اس میں دھویا، نچوڑ کر پہنا اور گھر کو دوڑ پڑا۔ فاطی وہاں چھپی رہی۔ عبدو ٹرنک لے کر آ گیا۔ دونوں نے لاش کو دوہرا کیا اور ٹرنک میں ڈالا۔ ٹانگیں دبا کر ڈھکنا بند کر دیا۔ یہ بند نہیں ہو رہا تھا۔ عبدو اُس کے اوپر بیٹھ گیا۔ فاطی نے کنڈی لگائی۔ عبدو تالا بھی لایا تھا جو ٹرنک کو لگا دیا گیا۔ فاطی نے چابی جھیڑ میں پھینک دی۔ دونوں نے ٹرنک اُٹھایا۔ عبدو نے سر پر رکھ لیا اور وہ ریلوے سٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ فاصلہ ایک میل کے لگ بھگ تھا۔

یہ قصبے کا ریلوے سٹیشن تھا۔ فاطی نے گھر آ کر دیکھا کہ اس کے کپڑوں پر لاش ٹرنک میں رکھتے کہیں کہیں خون لگ گیا تھا۔ اس نے کپڑے بدلے جو اس نے صبح سویرے دھو لیے۔

کپڑے بدلتے وقت اُس نے دیکھا کہ انگلی میں انگوٹھی نہیں ہے۔ اُس نے اِدھر اُدھر ڈھونڈی۔ کہیں بھی نہ ملی۔ شک پکا ہو گیا کہ جائے واردات پر لاش ٹرنک میں رکھتے گر پڑی ہو گی۔ دوسرے دن اُس نے عبدو کو دیکھا تو وہ خوش ہوئی کہ وہ پکڑا نہیں گیا۔ اُس نے اُسے بتایا کہ لاش دنیا کے دوسرے سرے پر پہنچ گئی ہے۔ فاطی نے اسے بتایا کہ انگوٹھی شاید وہاں اُتر کر گر پڑی ہے۔ عبدو اُسی وقت وہاں گیا۔ اُسے انگوٹھی نہ ملی۔ وہ دو آدمی غالباً پہلے ہی انگوٹھی اٹھا لے گئے تھے۔ عبدو اُسی سنار کے پاس گیا جس سے انگوٹھی خریدی تھی۔ وہ دوسری انگوٹھی لے آیا۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ پہلی انگوٹھی گم ہو گئی ہے۔

ریلوے سٹیشن پر خون

فاطی کا بیان ختم ہونے تک صبح ہو گئی۔ اُسے حوالات میں بند کر کے عبدو کو تفتیش کے کمرے میں بلایا۔ اُس نے اقبالی بیان دینے میں پس و پیش کی۔ میں نے اُسے فاطی کے دیئے ہوئے بیان کے بڑے ہی نازک

حصے سنائے اور کہا کہ یہ لڑکی عدالت میں تمہارے خلاف بیان دے گی، پھر تمہارے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔ اس نے بھی مجھے بتا دیا کہ کنور دیوان سنگھ نے اُسے کہا تھا کہ اقبالِ جرم نہ کرنا۔ میں نے جس طرح فاطی کے دماغ پر قبضہ کر لیا تھا اسی طرح عبدو کو بھی رام کر لیا۔ اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر اُس نے اقبالِ جرم کر لیا۔ لاش کو ٹرنک میں ڈالنے تک اس نے وہی کہانی سنائی جو فاطی کی زبانی آپ سن چکے ہیں۔ اس سے آگے اُس نے بتایا کہ ٹرنک بہت ہی وزنی ہو گیا تھا۔ اس نے راستے میں تین جگہ ٹرنک کھڑا کر کے زمین پر رکھا تاکہ اٹھانے میں آسانی ہو۔ ریلوے سٹیشن قصبے سے باہر تھا۔ وہاں تک پہنچتے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں لیکن فاطی کی محبت اور پکڑے جانے کے خطرے نے اُسے ہارنے نہ دیا۔

وہ اندھیرے میں پلیٹ فارم کی دوسری طرف بیٹھ گیا۔ سٹیشن ویران پڑا تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی آئی۔ اُس نے پہلے تو دوڑ کر ایک چھوٹا کمپارٹمنٹ دیکھا جس میں صرف تین مسافر تھے۔ تینوں سوئے ہوئے تھے۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ انجن نے وسل دی۔ وہ ڈر گیا کہ ٹرنک گاڑی میں نہیں رکھ سکے گا لیکن تنومند جوان تھا۔ اُس نے ٹرنک اٹھایا اور انجن کی دوسری وسل پر اُس نے ٹرنک گاڑی میں رکھا اور دھکیل کر سیٹ کے نیچے کر دیا۔ ٹرنک پوری طرح سیٹ کے نیچے نہیں گیا تھا۔ وہ چلتی گاڑی سے اُترا اور سٹیشن کی حدود

سے غائب ہو گیا۔

میں اُسے اُس کے گاؤں لے گیا۔ نمبردار اور مشیروں کو ساتھ لے کر عبدو سے برچھی برآمد کرائی۔ اس کے کپڑے برآمد کیے۔ ماں نے انہیں ابھی دھویا نہیں تھا۔ عبدو نے کُرتہ جوہڑ میں صابن کے بغیر دھویا تھا۔ خون کے نشان ابھی باقی تھے۔ اُس نے جو چادر باندھ رکھی تھی اس پر بھی چند ایک چھینٹے تھے۔ برچھی کو اس نے اچھی طرح صاف کر دیا تھا۔ اس کا تین دھارا پھل بہت تیز تھا...... نمبردار مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اُس نے میری اور میرے سٹاف کی بہت پُرتکلّف دعوت کی۔ اُس نے مجھ سے رازداری سے پوچھا — "کیا عبدو واقعی حسنین کا قاتل ہے؟" — اس نے میرے ساتھ دیانتداری سے تعاون کیا تھا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ قاتل عبدو ہے اور مقتول کی لاش اس نے اور فاطی نے ٹرنک میں ڈالی اور عبدو نے رات کی گاڑی میں رکھی تھی۔ میں نے اسے قتل کی کچھ باتیں بھی بتا دیں۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ اُسے قبل از وقت یہ بات بتا کر میں نے غلطی کی تھی۔ وہ نمبردار تھا۔ پولیس کی کارروائی کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ میں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ دونوں ملزموں نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔

"آپ کو اقبالی بیان مجسٹریٹ کے پاس لکھوانا ہو گا۔" اس نے پوچھا۔

"یہاں تو نہیں ہو سکتا۔ آپ انہیں کب لے جا رہے ہیں؟"

قصبہ چھوٹا تھا۔ اقبالی بیان مجسٹریٹ نے ریکارڈ کرنا تھا۔ وہ بیالیس

میل دُور ضلعی شہر میں تھا۔ میں نے وقت دیکھا۔ تین بج رہے تھے۔ ایک گاڑی سوا چار بجے گزرتی تھی۔ میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہاں کے تین چار مجسٹریٹوں سے میری بڑی اچھی راہ و رسم تھی۔ ان میں سے کسی کے گھر پر جاکر بیان ریکارڈ کروا سکتا تھا۔ مجھے خطرہ یہ نظر آرہا تھا کہ کنور دیوان سنگھ ملزموں کو گمراہ کر دے گا۔ وہ انہیں سمجھا سکتا تھا کہ وہ مجسٹریٹ کے سامنے جاکر اقبالی بیان دینے سے انکار کر دیں اور یہ بیان دیں کہ اس داروغہ نے انہیں بہت مارا پیٹا ہے اور ڈرا دھمکا کر لایا ہے..... میں نے نمبردار کو بتا دیا کہ میں ملزموں کو اسی گاڑی سے لے جا رہا ہوں۔

میں اُسی وقت گاؤں سے روانہ ہو گیا۔ یکے نے جلدی تھانے پہنچا دیا۔ عبدو ہتھکڑیوں میں تھا۔ فاطی کو ہتھکڑی نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ عورت کو ہتھکڑی نہیں لگائی جاتی تھی۔ آپ میری خوشی کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں نے کنور دیوان سنگھ کو چیلنج کیا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر قاتلوں کو پکڑ لوں گا۔ میں نے چیلنج پورا کر دیا تھا۔ میرے لیے اب شہادت اور ثبوت فراہم کرنے کا مرحلہ تھا۔ اقبالی بیان ریکارڈ کرانے کے بعد مجھے یہ مرحلہ طے کرنا تھا۔ گاڑی میں ٹرنک رکھنے والے آدمی کی شناخت ضروری تھی۔ میرے استغاثہ میں یہ خانہ خالی تھا۔ وہ میں نے اس طرح پورا کر لیا تھا کہ عبدو کو اسی حوالات میں بند رکھا تھا جہاں تین ڈوم بند تھے۔ انہوں نے عبدو کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔

میں نے ارادہ کیا تھا کہ ان ڈوموں کو اس مقصد کے لیے استعمال کروں گا کہ تینوں عدالت میں گواہی دیں گے کہ گاڑی میں ٹرنک عبدو نے رکھا تھا اور انہوں نے اُسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ یہ دراصل جھوٹی گواہی تھی لیکن یہ یقین کر کے کہ یہ شخص قتل کا مجرم ہے تا اسے سزا دلانے کے لیے جھوٹی گواہی کا سہارا لینے کی سوچی تھی۔ بعض اوقات قتل کے ملزم استغاثہ کی ذرا سی بھول چوک کی وجہ سے صاف بری ہو جاتے ہیں۔

ڈوموں کو تو اب رہا ہی کرنا تھا۔ میں نے فاطی اور عبدو کے اقبالی بیان میں اُن سے کہلوایا تھا کہ اِن ڈوموں کا اُن کے جُرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

میں نے فاطی کو حوالات سے نکلوایا۔ دو کانسٹیبل ساتھ لیے اور ریلوے سٹیشن کو چل پڑا۔ میں نے دیکھا کہ تھانے کے احاطے کے باہر دو دیہاتی کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ مجھے اور میرے قافلے کو دیکھ کر وہ وہاں سے چلے گئے۔ میں ریلوے سٹیشن پہنچا اور ایک کانسٹیبل کو پیسے دے کر ٹکٹ لینے کے لیے بھیجا۔ پلیٹ فارم پر میں تھا۔ مجھ سے سات آٹھ قدم دُور عبدو تھا۔ اُس کی ہتھکڑی کی زنجیر ایک کانسٹیبل نے پکڑ رکھی تھی۔ فاطی کانسٹیبل کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ اچانک پانچ دیہاتی، مسافر خانے سے آئے۔ پانچوں کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ میں نے انہیں آتے دیکھا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے اُن کے ارادے کا علم نہ تھا۔ مجھے ہڑبونگ سنائی دی۔ کانسٹیبل کی پکار "ملک صاحب"

سنائی دی۔ میں نے گھبرا کر اُدھر دیکھا تو پانچوں آدمی برچھیوں سے عبدو اور فاطی کا قیمہ کر رہے تھے۔ کانسٹیبل نہتہ تھا۔ وہ ہتھکڑی چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ عبدو اور فاطی پلیٹ فارم پر تڑپ رہے تھے اور پانچوں آدمی ان پر برچھیاں برسا رہے تھے۔ میرے پاس ریوالور تھا۔ میں نے ریوالور نکال کر ہوا میں دو فائر کیے۔

ان پانچوں نے ایک ایک دو دو وار مزید کر کے میری طرف دیکھا میں انہیں للکارتا ہوا ان تک پہنچ گیا تھا۔ اگر خطرہ ہوتا کہ وہ کسی اور پر یا مجھ پر حملہ کر دیں گے تو میں اُن پر ریوالور خالی کر دیتا، لیکن انہوں نے برچھیاں میرے آگے پھینک دیں اور میرے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ایک نے کہا — "ہمیں گرفتار کر لو۔ بھاگیں گے نہیں۔ ہم نے اپنے لڑکے کے خون کا بدلہ لے لیا ہے۔"

ان میں حسنین کے بھائی تھے۔ ایک اُس کا چچا تھا۔ ایک حسنین کا بھائی اور ایک اُس کا ماموں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ نمبردار نے مجھ سے یہ کیوں پوچھا تھا کہ کیا عبدو ہی حسنین کا قاتل ہے اور اُس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ میں انہیں مجسٹریٹ کے پاس کب لے جا رہا ہوں۔ میں نے اُسے صحیح جواب دے کر غلطی کی تھی۔ بعد میں نمبردار نے مجھے بتا بھی دیا تھا کہ اُس سے حسنین کے ان رشتہ داروں نے کہا تھا کہ پتہ کرا دو کہ کیا یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حسنین کا قاتل عبدو ہے؟ ... کی روایت تھی اور یہ ان لوگوں کا رواج تھا کہ قتل کا

انتقام خود لیتے تھے۔ نمبردار نے انہیں بتا دیا تھا کہ عبدو اور فاطی کو ریلوے سٹیشن پر لے جایا جا رہا ہے۔

عبدو اور فاطی کے جسموں کا کون سا حصہ ہو گا جہاں برچھی نہ اتری ہو گی۔ خون پلیٹ فارم سے بہہ کر ریلوے لائن پر گر رہا تھا۔ میں نے کنور دیوان سنگھ کو بلوایا۔ وہ آیا تو میں نے اُسے کہا — "لو کنور جی! یہ کیس آپ کا ہے۔ اب میں آپ کا گواہ ہوں۔ اللہ نے میرے کیس کا یہیں فیصلہ کر دیا ہے۔"

کنور دیوان سنگھ نے کہا — "ملک صاحب! یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کیس سے جان چھڑائی تھی اور یہ آپ کے سر ڈال کر آپ کو ناراض کیا ہے۔ اس قبیلے کا کیس کوئی دل والا انسپکٹر لیا کرتا ہے۔"

زندگی کے میلے

اس بدکار خود ساختہ حکیم
نے چھ بار اس لڑکی کو ہوس کاری
کا نشانہ بنا کر زہر دیا تھا مگر لڑکی
کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دودھ
میں زہر کی کتنی مقدار ڈالے کہ
وہ فوراً نہ مر جائے۔

کہتے ہیں چور چوری سے باز آجاتا ہے، ہیرا پھیری سے باز نہیں آتا۔ اسی
طرح تھانیدار ریٹائر ہو کر گھر آجاتا ہے مگر تھانیداری سے باز نہیں آتا۔ یہی
حالت میری تھی جب مجھے ریٹائر کیا گیا۔ اتنا عرصہ تھانیداری کرتے کرتے
گاؤں میں آیا تو میرے لیے عام قسم کا شہری بلکہ دیہاتی بن کے رہنا بہت
ہی مشکل ہو گیا۔ مثلاً ایک روز بیوی نے مجھے کہا کہ بھینس کا کٹا کھل کر باہر
نکل گیا ہے۔ بیوی نے یہ بھی کہا کہ مویشی جوہڑ میں اتر جاتے ہیں۔ کٹا
وہیں ہو گا لیکن میں نے گھر سے کٹے کا کھرا اٹھانا شروع کیا تو گاؤں سے
اُس طرف باہر نکل گیا جس طرف جوہڑ نہیں تھا۔ میں نے کٹے کے کھل کر نکل
جانے کو جرم و جاسوسی کی واردات بنا دیا اور جب میں سراغرسانی کی
کوئی بہتر لائن سوچتا ہوا گھر آیا تو کٹا کھرلی پہ بندھا ہوا تھا۔

گاؤں میں سارا دن بیکار پڑے رہنے سے طبیعت اکتا جاتی تھی قریبی
تھانہ آٹھ میل دور تھا۔ وہاں میرا ایک شاگرد تھانیدار لگا ہوا تھا۔ ایک

روز اُس کے ہاں چلا گیا۔ تھانے میں جا کر طبیعت کو سکون آگیا۔ میں نے
اپنے شاگرد سے کہا۔ "مجھے حوالات میں بند کر دو، گاؤں میں جی
نہیں لگتا۔"

اُس نے مشورہ دیا کہ گاؤں میں جب کبھی طبیعت اچاٹ ہو جائے
تو میں کچھ دن اس کے ہاں گزار جایا کروں۔ وہ میرا عزیز دوست تھا۔ اب
بھی دوست ہی ہے۔ اونچے عہدے پر پہنچ گیا ہے۔ میں نے یہ معمول بنا
لیا کہ آٹھ دس روز بعد اس کے ہاں چلا جاتا۔ دو تین دن اس کا مہمان
رہتا۔ وارداتوں اور مقدموں میں دلچسپی لیتا تو طبیعت بحال ہو جاتی۔

ایک بار یوں ہوا کہ میں ایک مہینہ اس کے ہاں نہ گیا۔ ایک روز
اس کا ایک کانسٹیبل آیا۔ کہنے لگا کہ خان صاحب بلاتے ہیں۔ اُس نے
گھوڑا بھیجا تھا لیکن میں اپنے گھوڑے پر گیا۔ اس نے کہا۔ "ملک
صاحب! آپ کے مطلب کا ایک کیس آیا ہے۔ میں نے اسی لیے آپ کو بلایا
ہے۔" میں نے اس کے ہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ یہ قتل کی واردات تھی۔

اس تفتیش کی کہانی سنانے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں
کہ میں خان صاحب کا نام نہیں بتاؤں گا کیونکہ وہ ابھی سروس میں ہیں۔
پولیس کے احکام کے مطابق کسی ایسے افسر کا نام کسی کہانی یا مضمون میں
استعمال نہیں ہو سکتا جو ابھی سروس میں ہو۔ ان کے نام کو پوری طرح
چھپائے رکھنے کے لیے میں واردات کے موقعہ اور مقام کی بھی واضح
نشاندہی نہیں کروں گا۔ آپ کو دلچسپی کہانی سے ہونی چاہیئے۔ نام اور مقام

کو آپ کیا کریں گے۔ خان صاحب ہی کافی سمجھئے۔ پولیس میں بے شمار خان صاحب، ملک اور چوہدری ہیں۔

واردات یہ تھی کہ ایک برانچ لائن سے رات کے وقت ایک پسنجر گاڑی گزرا کرتی تھی۔ صبح کے وقت ریلوے لائن پر ایک جوان عورت کی لاش دیکھی گئی۔ سر لائن سے باہر دھڑ سے کٹا پڑا تھا اور دھڑ دونوں لائنوں کے درمیان پڑا تھا۔ میں جب خان صاحب کے پاس پہنچا تو لاش کا پوسٹ مارٹم ہو چکا تھا اور لاش وارثوں کے حوالے کی جا چکی تھی۔ میں لاش کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک آدمی مقتولہ کے گاؤں بھیجا کہ لاش کو ابھی دفن نہ کریں لیکن لاش دفنائی جا چکی تھی۔ خان صاحب نے دو چیزیں نوٹ کی تھیں۔ ایک یہ کہ خون کا ایک قطرہ بھی موقعۂ واردات پر نظر نہ آیا۔ دوسری یہ کہ لاش کی گردن پر سے ریل کا پہیہ گزرا تھا۔ اس سے یہ ثبوت ملتا تھا کہ اس عورت کو کسی اور طریقے سے غالباً گلا دبا کر قتل کیا گیا پھر لاش ریلوے لائن پر اس طرح رکھ دی گئی کہ گردن لائن کے اوپر رکھی گئی۔

اگر یہ حادثہ ہوتا تو مقتولہ کے جسم کے کئی ٹکڑے ہو جاتے۔ صرف گردن کٹنے سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرنے والی نے خودکشی کی ہے لیکن اس صورت میں وہاں بہت خون ہونا چاہیئے تھا۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے خون کی غیر موجودگی اور لاش کا اکڑاؤ اور اندرونی اعضاء کا معائنہ کر کے رائے دی تھی کہ مقتولہ کی موت پوسٹ مارٹم کے وقت سے سولہ سے اٹھارہ گھنٹے (اندازاً) پہلے واقع ہوئی ہے۔ پوسٹ مارٹم دن کے ساڑھے بارہ بجے ہوا تھا۔ اس کے مطابق موت شام ساڑھے چھ سے ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہوگی۔ عورت کے جسم پر تشدد کا کوئی نشان نہیں تھا اور نہ اس کی عزت پر حملہ ہوا تھا۔

آدھی رات کے لگ بھگ ایک پسنجر ٹرین گزرا کرتی تھی جس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ ٹائم ٹیبل میں اس کا وقت گیارہ بج کر بیالیس منٹ تھا لیکن گاڑی ٹائم ٹیبل کی پابند نہیں تھی۔ پاکستان بن چکا تھا۔ آزادی کا چوتھا سال تھا۔ ریلوے کا محکمہ بھی آزاد ہو گیا تھا۔ گاڑیوں کے اوقات کی پابندی ختم ہو چکی تھی۔ خان صاحب ریلوے سٹیشن سے پتہ کروا چکے تھے۔ پسنجر ٹرین رات بارہ بج کر ستر منٹ پر سٹیشن سے روانہ ہوئی تھی۔ جائے واردات پر بارہ بج کر پچیس یا ستائیس منٹ پر پہنچی ہوگی۔ اس سے پہلے شام چھ بج کر بیس منٹ پر ایک انجن جس کے ساتھ گارڈ کی صرف ایک وین تھی سٹیشن سے رن تھرو ہوا تھا۔

اس وقت تک چونکہ سورج غروب نہیں ہوا تھا اس لیے ممکن نہیں تھا کہ دن کی روشنی میں قاتل نے لاش لائن پر رکھی ہوگی۔ اگر مقتولہ جیتی جاگتی گاڑی کے نیچے آئی ہوتی تو قریب کے کھیتوں میں کام کرنے والے اور گزرنے والے لوگ اس کٹی ہوئی لاش کو دیکھ لیتے لیکن خون موجود نہ ہونے سے کوئی شک نہیں رہ گیا تھا کہ عورت کو قتل کر کے پانچ چھ گھنٹے بعد لاش

لائن پر رکھی گئی ہوگی۔ جسمانی اکڑاؤ سے ڈاکٹروں نے رائے دی کہ وہ رات بارہ بجے نہیں بلکہ پانچ چھ گھنٹے پہلے مری ہے۔

گاڑی کے نیچے آنے کا وقت معلوم کرنے کے لیے میں اور خان صاحب سٹیشن ماسٹر سے جا ملے اور اُسے کہا کہ وہ اس انجن کے ڈرائیور کا نام اور پتہ معلوم کر دے جو گارڈ وین کو لے کے شام چھ بج کر بیس منٹ پر رن تھرو ہوا تھا، اور پسنجر ٹرین کے ڈرائیور کا بھی۔ سٹیشن ماسٹر جوان سا آدمی تھا اور ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے جواب دیا۔ "اگر آپ نہ آتے تو بھی میں آج رات یہ اطلاع تھانے میں پہنچا دیتا کہ عورت کون سے ڈرائیور نے ماری ہے۔ وہ انجن جو بریک وین لے کے گیا تھا، تقریباً ایک گھنٹہ بعد واپس آ رہا ہے۔ اسے روک لوں گا۔ لوکن نہیں دوں گا۔ پسنجر ٹرین کا جو ڈرائیور تھا وہ کل صبح ساڑھے آٹھ بجے یہاں سے واپس گزرے گا۔ وہ اُدھر جانے والی پسنجر ٹرین لا رہا ہے۔"

ڈرائیور نے لاش دیکھی تھی

تفتیش بڑا ہی صبر آزما کام ہوتا ہے۔ اکثر اوقات ایک معمولی سی ضمنی بات معلوم کرنے کے لیے رات رات جاگنا پڑتا ہے، لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے ہیں، در در، گلی گلی جھک مارنی پڑتی ہے۔ دماغ ماؤف اور جسم ٹوٹ جاتا ہے۔ اس جھک جھک سے بچنے کے لیے پولیس دو طریقے استعمال

کیا کرتی ہے۔ ایک وعدہ معاف گواہ اور دوسرا تھرڈ ڈگری طریقہ یعنی پھینٹی۔ اگر مشتبہ دو یا اس سے زیادہ ہوں تو ان میں سے ایک کو لالچ یا اذیت یا دونوں دے کر وعدہ معاف گواہ بنا لیا جاتا ہے۔ اگر مشتبہ ایک ہی ہو تو اُسے اس قدر اذیت دی جاتی ہے کہ وہ اقبالِ جرم کر لیتا ہے۔ پاکستان نے تفتیش اور سراغ رسانی میں تو کوئی ترقی نہیں کی، اذیت دینے کے طریقوں میں حیران کن ترقی کی ہے۔ اکثر اوقات بے گناہ بھی اس تشدد کا نشانہ بن جاتے ہیں۔

میرے عزیز دوست اور شاگرد کے لیے بھی آسان طریقہ یہ تھا کہ مقتولہ کے خاوند اور دیگر مشتبہ افراد کو بلا کر تھرڈ ڈگری والی پھینٹی چڑھاتے تو تفتیش آسان ہو جاتی مگر ان میں میرے والی خرابی تھی۔ وہ کسی بے گناہ کو محض شک کی بنا پر پریشان کرنا تو درکنار تھانے بلانا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

ہم ریلوے سٹیشن پر انتظار کرتے رہے۔ جس انجن کو ایک گھنٹے بعد آنا تھا وہ پونے دو گھنٹے بعد آیا۔ اس کے ڈرائیور نے بتایا کہ اس کے انجن کے نیچے کوئی عورت نہیں آئی۔ البتہ اس نے یہ انکشاف کیا کہ رات والی پسنجر ٹرین کا ڈرائیور اُسے آخری سٹیشن پر ملا تھا۔ اُس نے اس کے ساتھ ذکر کیا تھا کہ رات اُس کی گاڑی کے نیچے ایک عورت کٹ گئی ہے۔

دوسری صبح ہم ساڑھے آٹھ بجے پھر ریلوے سٹیشن چلے گئے۔ گاڑی خاصی دیر بعد آئی۔ وہی ڈرائیور تھا۔ سٹیشن ماسٹر نے اسے اپنے دفتر میں

بلا لیا۔ ہمارے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وقوعہ کی رات اس سٹیشن پر تین منٹ رُک اس نے گاڑی چلائی۔ سٹیشن سے کوئی ڈیڑھ میل دور انجن کی روشنی میں اُسے ریلوے لائن پر کوئی لیٹا ہُوا نظر آیا۔ ڈرائیور کو وہ اُس وقت نظر آیا جب انجن اور اس آدمی کے درمیان پچیس تیس گز کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ گاڑی روکی نہیں جا سکتی تھی۔ اتنے کم فاصلے پر بریک لگانا خطرناک تھا۔ گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ ڈرائیور نے بار بار وِسل بجائی مگر اس آدمی نے کوئی حرکت نہ کی۔ انجن قریب پہنچا تو ڈرائیور نے غور سے دیکھا۔ لائن پر آدمی نہیں بلکہ عورت تھی۔

ڈرائیور انجن کی روشنی میں تھوڑے سے وقت میں جو کچھ دیکھ سکا وہ یہ تھا کہ عورت کے کپڑے رنگ دار تھے۔ اس کے سر سے دوپٹہ ہٹا ہُوا تھا۔ اس کی گردن لائن پر تھی۔ سر پیچھے کو ڈھلکا ہُوا تھا۔ دھڑ اندر کی طرف تھا۔ لاش پیٹھ کے بل تھی۔ دونوں بازو پہلوؤں کے ساتھ تھے۔ انجن اس کے اوپر سے گزر گیا۔ گاڑی میں ڈبوں میں سے جو روشنی باہر آ رہی تھی اس میں ڈرائیور کو عورت کا سر کٹ کر گرتا نظر آیا تھا۔

یہ پرانا ڈرائیور تھا۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کی ساری سروس میں یہ پانچواں انسان اس کی گاڑی تلے آیا ہے۔ ایک آدمی اپنی بھینس کو لائن سے ہٹاتے انجن کی زد میں آ گیا تھا۔ دوسرا اٹاری کے قریب بند پھاٹک سے گزرتے گاڑی کے نیچے آ گیا تھا۔ امرتسر سے آگے ایک آدمی ریلوے لائن کے قریب کھڑا تھا۔ انجن قریب پہنچا تو وہ لائن پر بیٹھ گیا۔ اُس کا جسم قیمہ ہو گیا تھا۔ پھر ایک بار جالندھر سے تین میل دُور اُس نے ایک آدمی کو لائن کے ساتھ اُس سمت جاتے دیکھا جس سمت اس کی گاڑی جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے وِسل دی لیکن اس آدمی نے دھیان نہ دیا۔ انجن قریب پہنچا تو اس آدمی نے اپنے آپ کو لائن پر پھینک دیا۔ اس کے جسم کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ یہ دونوں وارداتیں خودکشی کی تھیں مگر اس عورت کے متعلق اس کی رائے یہ تھی کہ وہ زندہ نہیں بلکہ مردہ تھی ورنہ وہ کچھ تو حرکت کرتی۔ ہو سکتا ہے وہ کوئی پاگل ہو۔

ہم نے ڈرائیور کا بیان لکھ لیا اور اسے گواہوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ گاڑی کے نیچے آنے کا وقت رات ساڑھے بارہ بجے لکھا گیا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق موت اس سے چار سے چھ گھنٹے پہلے واقع ہوئی تھی۔ مقتولہ کے متعلق خان صاحب نے جو معلومات فراہم کیں، ان کے مطابق وہ شادی شدہ تھی۔ شادی ہوئے ایک سال گزر گیا تھا۔ وہ مہاجر تھی۔ خاوند بھی مہاجر تھا۔ موت کے وقت اس کی عمر تیئیس سال تھی۔ رپورٹ درج کرانے اس کا خاوند آیا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ صبح اٹھا تو بیوی بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ دونوں چھت پر سوئے تھے۔ خاوند نے سوچا کہ بیوی اس سے پہلے جاگ کر کام کاج میں لگ گئی ہو گی۔ نیچے آیا تو اسے معلوم ہُوا کہ بیوی نیچے نہیں آئی۔ سورج طلوع ہو رہا تھا تو گاؤں کے ایک آدمی نے آ کر اطلاع دی کہ فلاں عورت ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔ سارا

گاؤں دوڑ پڑا۔

لاش کے دھڑ پر چادر ڈال دی گئی اور کٹے ہوئے سر کو بھی ڈھانپ دیا گیا۔ خاوند تھانے چلا گیا۔ خان صاحب موقع پر پہنچے اور جو کارروائی کرنی تھی وہ کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ خاوند نے خان صاحب سے تین بار کہا کہ اس کی بیوی نے خودکشی کی ہے۔ خان صاحب نے اسے یہ تاثر دیا کہ وہ مان گئے ہیں کہ اس کی بیوی نے خودکشی ہی کی ہے۔ خان صاحب نے مجھے بتایا کہ خاوند اس طرح ہنسی خوشی تھانے سے نکلا جیسے کسی طالب علم نے بڑا مشکل پرچہ صحیح حل کر دیا ہو۔ خان صاحب نے اسے تھوڑی دیر خوش رہنے کے لیے آزاد کر دیا۔

ریلوے سٹیشن سے ڈرائیور کا بیان لے کر ہم تھانے میں گئے تو مقتولہ کے خاوند، گاؤں کے نمبردار اور مقتولہ کے باپ کو بلا بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آ گئے۔ سب سے پہلے خاوند کو اندر بلایا۔ اسے ہم نے ڈرانے دھمکانے کی بجائے دوستانہ طریقے سے بٹھایا۔ وہ دیہاتی آدمی تھا۔ عمر چھبیس اور اٹھائیس کے درمیان، شکل و صورت اور گفتگو سے پتہ چلتا تھا کہ ہے تو دیہاتی لیکن سیدھا سادا نہیں۔ اس سے خان صاحب نے پہلا سوال یہ پوچھا۔

"تم نے اتنے یقین سے کس طرح کہہ دیا ہے کہ تمہاری بیوی نے خودکشی کی ہے؟ کیا وہ گھر میں پریشان رہتی تھی؟ تم اسے مارتے پیٹتے تھے؟ یا کوئی اور وجہ تھی؟"

میں اُس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ اس پر صاف تبدیلی آئی اور وہ اِدھر

اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ جواب ڈھونڈ رہا تھا۔ کچھ کہنے لگا مگر ہکلا کر چپ ہو گیا۔ میں نے اُسے کہا "گھبراؤ نہیں یار، ہم یہ تو نہیں کہتے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے۔ اگر تم اُسے مارتے پیٹتے تھے تو بتا دو۔ ہم لکھ لیں گے تمہاری بیوی نے خانگی حالات سے تنگ آ کر خودکشی کر لی ہے۔"

اس کا حوصلہ ٹھکانے آ گیا۔ کہنے لگا۔ "پہلے تو وہ میرے ساتھ بہت خوش تھی۔ کوئی تین مہینوں سے اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اسے غصہ آ جاتا تھا اور لڑ پڑتی تھی۔ ایک مہینہ گزرا اس نے میری ماں کی بے عزتی کر دی تو میں نے اسے بہت پیٹا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے دو دفعہ پیٹا تھا۔ مرنے سے تین چار روز پہلے اس نے مجھے کہا تھا کہ میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔ میں نے توجہ نہ دی کیونکہ میں اسے اتنا دلیر نہیں سمجھتا تھا۔"

وہ ہمارے ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا کہ ایک سال میں وہ نو مہینے خوش اور مطمئن رہی مگر آخری تین مہینے اس کا رویہ کیوں بدل گیا؟ ہم نے یہ بھی پوچھا کہ کیا اُس کے علم میں کوئی ایسی بات کبھی آئی تھی کہ اس کی بیوی نے کسی اور کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے ہوں اور اس کے رویے کی تبدیلی کا باعث یہی تعلقات ہوں؟

اُس نے پُرزور طریقے سے کہا کہ اُسے اپنی بیوی پر ایسا کوئی شک نہیں تھا اور نہ وہ اس قسم کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ایک سال میں اس کی بیوی میں بچے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ اُس نے دیہاتیوں

کی طرح جواب دیا — "یہ تو اللہ کی مرضی ہے"۔ میں نے اس ضمن میں بہت کریدا۔ ہیر پھیر کر سوال کیے مگر اس کے منہ سے کام کی کوئی بات نہ نکلی اسے ہم نے باہر نکال دیا۔

میں نے خان صاحب کو مشورہ دیا کہ اس کی ماں کو بلائیں۔ اس دوران ہم نے مقتولہ کے باپ کو اندر بلایا۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستان کے مہاجر ہیں۔ ان کی تقریباً ساری برادری اس گاؤں میں آباد ہوئی ہے ایک سال گزرا اس نے اپنی بیٹی (مقتولہ) کی شادی اس آدمی کے ساتھ کر دی۔ لڑکی آٹھ نو مہینے بہت خوش رہی۔ ہنستی کھیلتی آتی اور ہنستی کھیلتی سسرال جاتی تھی۔ تین چار مہینوں سے وہ پریشان نظر آنے لگی تھی۔ پہلے تو اس نے کچھ نہ بتایا۔ ڈیڑھ ایک مہینہ ہوا اس نے اپنی ماں کو بتایا تھا کہ خاوند نے اسے مارا ہے۔ اس کے بعد اس نے کئی بار اپنی ماں کو بتایا کہ خاوند اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے۔

"تم نے یا تمہاری بیوی نے کبھی اپنی بیٹی کے خاوند سے پوچھا تھا کہ وہ اسے کیوں مارتا پیٹتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"کبھی نہیں"۔ اس نے جواب دیا — "ہم اپنی بیٹی کو سمجھاتے رہے کہ وہ خاوند کی مرضی کے مطابق چلے اور اسے ناراض نہ ہونے دے"۔

لاش کے پاؤں اور جوتی —

ایک راز

کیا یہ آدمی (مقتولہ کا باپ) اتنا شریف یا کمزور تھا کہ وہ اپنے داماد کو کچھ کہنے سے ڈرتا تھا؟ دیہات کے لوگ تو ان باتوں پر ایک دوسرے کے سر کھول دیتے ہیں۔ ذرا سی بے مزگی پیدا ہو جائے تو شادی شدہ بیٹیوں کو گھر بٹھا لیتے ہیں۔ میں نے اس پر سوال کرنے کی بجائے اس کے اس رویے کی تعریف شروع کر دی اور ایسی دوستانہ باتیں کیں کہ وہ بھول گیا کہ وہ تھانے میں دو تھانیداروں کے ساتھ بیٹھا ہے۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے — "ایک روز میری بیٹی روتی ہوئی گھر آئی۔ خاوند نے اسے بہت پیٹا تھا اور اس نے یہ بھی کہا کہ خاوند مجھے طلاق دینا چاہتا ہے۔ پھر بھی میں نے اسے واپس بھیج دیا تھا۔ وہ نہیں جاتی تھی۔ میں نے اسے زبردستی گھر سے نکال دیا"۔

"تم نے بہت اچھا کیا"۔ میں نے اس کی پیٹھ تھپکاتے ہوئے کہا اور پوچھا — "اپنے داماد کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے؟ وہ کسی دوسری عورت کے جال میں تو نہیں پھنس گیا تھا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا"۔ اس نے کہا — "لیکن وہ ایسا آدمی نہیں۔ ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں کوئی ایک بھی عورت ایسی نہیں جو خراب چال چلن کی ہو"۔

"تمہیں اپنی بیٹی کے چال چلن کے متعلق یقین ہے کہ ٹھیک تھا؟" — خان صاحب نے بم پھینکا۔

وہ بدک گیا اور گھبراہٹ کے لہجے میں اُس نے کہا۔ "جی جی ہاں! اس کا چال چلن بہت اچھا تھا۔"

میں اپنی کہانیوں میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ بعض حالات میں ہم مشتبہ افراد کی باتیں کم سنتے ہیں اور چہروں کا اتار چڑھاؤ زیادہ دیکھتے ہیں۔ میں اس اتار چڑھاؤ کو بیان نہیں کر سکتا۔ یہ مہارت تجربے اور مشاہدے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس آدمی نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ اگر اس کی بیٹی کا چال چلن ٹھیک تھا تو کوئی اور گڑبڑ ہوگی اور یہ گڑبڑ جو کچھ بھی تھی وہ اس آدمی کے سینے میں چھپی ہوئی تھی۔ اگر ریلوے لائن پر خون ہوتا تو اسے خودکشی کی واردات سمجھ لیا جاتا۔ خودکشی کا باعث خانگی تنازعہ لکھ دیا جاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ مقتولہ قتل ہوئی تھی۔ قتل کا باعث رقابت بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے مقتول کے باپ سے پوچھا "تمہاری بیٹی کا رشتہ کسی اور نے بھی مانگا تھا؟"

اس سوال کا جواب 'ہاں' یا 'نہیں' ہونا چاہیے تھا لیکن یہ شخص بوکھلا گیا۔ میں نے اپنا مخصوص طریقہ اختیار کیا۔ وہ یہ تھا کہ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور چپ چاپ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اُس نے سوائے ہکلانے کے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بالکل ہی چپ ہو کر میرے

منہ کی طرف دیکھنے لگا لیکن میری آنکھوں کا سامنا نہ کر سکا۔ کبھی بائیں دیکھتا کبھی دائیں اور جب میری طرف دیکھتا تو اس کے ہونٹ کانپتے مگر آواز نہ نکلتی.... میں ڈیڑھ دو منٹ اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ آخر اس کی ٹھوڑی تھام کر میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا اور نرم سے لہجے میں پوچھا۔ "تم کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں حضور!" اُس نے جیسے گہری نیند سے جاگ کر کہا ہو۔ "آپ سے کیا چھپا سکتا ہوں؟" اور اچانک اُس کے آنسو نکل آئے اور وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

میں اور خان صاحب اُسے دیکھتے رہے۔ اُسے تسلّی دلاسہ نہ دیا۔ روتے روتے اُس نے کہا۔ "اللہ کسی عزّت دار کو بیٹی نہ دے۔"

اس کے بعد ہم نے اس پر سوالوں کی بوچھاڑ کر دی مگر اس نے کام کی کوئی بات نہ بتائی۔ خان صاحب نے اس سے پوچھا کہ اس نے یہ کیوں کہا ہے کہ اللہ کسی کو بیٹی نہ دے۔ اس کا جواب اس نے فوراً دیا۔ اُس نے کہا۔ "اگر میری بیٹی نہ ہوتی تو آپ مجھ سے یہ نہ پوچھتے کہ تمہاری بیٹی کا چال چلن کیسا ہے اور اس کا رشتہ کسی اور نے مانگا تھا یا نہیں۔"

اس کی یہ بات میرے دل میں اتر گئی۔ میں نے سوچا کہ عزّت دار کمزور آدمی ہوتا ہے۔ پھر بھی ہم نے اسے تفتیش سے خارج نہیں کیا۔ اُسے باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو خان صاحب نے مجھ سے کہا "ملک صاحب! آپ

نے ٹھیک کہا تھا کہ اس شخص نے کچھ چھپا لیا ہے مگر آپ اس کے رونے سے مدم ہو گئے۔"

"وہ ابھی گیا کہاں ہے۔" میں نے کہا — "یہیں تو ہے۔ ذرا اسے دم لینے دو۔۔۔ مقتولہ کی ساس کو اندر بلاؤ۔"

وہ آ چکی تھی۔ اُسے اندر بلایا اور پوچھا کہ اس کا بیٹا اپنی بیوی کو مارتا پیٹتا کیوں تھا؟ اُس نے جواب دیا کہ لڑکی منہ پھٹ ہو گئی تھی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آٹھ نو مہینے وہ ٹھیک ٹھاک رہے، پھر وہ لڑنے جھگڑنے لگے۔ خان صاحب نے اُس سے پوچھا — "وہ رات کہاں سوتے تھے؟"

اُس نے جواب دیا۔ "چھت پر۔"

"جس رات تمہاری بہو غائب ہوئی اُس رات یا دن کو بھی خاوند نے اُسے پیٹا تھا؟" خان صاحب نے پوچھا اور ساس نے نفی میں جواب دیا۔

"پھر سوچ کر بتاؤ" — خان صاحب نے کہا — "تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ تمہاری بہو تمہارے بیٹے کے ساتھ چھت پر گئی تھی اور وہیں سوئی تھی؟"

"سوچنا کیا!" ساس نے کہا — "دونوں روزانہ اوپر سوتے تھے۔"

"رات کو تم نے چھت پر سے کسی کو اترتے نہیں دیکھا؟" خان صاحب نے پوچھا اور اُسے یوں لقمہ دیا — "تمہاری بہو رات کو اٹھ کر ریلوے لائن پر چلی گئی تھی۔ وہ کس طرف سے اتری ہوگی؟"

"ارے ہاں"۔ بڑھیا نے چونک کر کہا — "صبح سویرے میرا بیٹا جاگا

اور باہر نکل گیا۔ فوراً واپس آ گیا۔ اُس نے سیڑھی اُٹھا رکھی تھی۔ میں بھینس
[کو] چارہ ڈال رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ بیٹا! یہ سیڑھی کہاں سے لاتے ہو؟
[ا]س نے غصے سے کہا کہ یہ سیڑھی باہر کس نے رکھی تھی؟ بڑی مشکل سے
[یہ] چیزیں بنتی ہیں۔ پھر اُس نے اپنی بیوی کے متعلق پوچھا تو میں نے اُسے
[ک]ہا کہ وہ تو ابھی اوپر سے ہی نہیں آئی۔ میرے بیٹے نے حیران ہو کر کہا کہ وہ
[ا]وپر تو نہیں ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ یہ سیڑھی اُسی نے تو باہر نہیں رکھی
[تھ]ی؟ اپنے بیٹے کی گھبراہٹ دیکھ کر مجھے فکر پیدا ہوئی۔ صحن کے اندر سے
[س]یڑھیاں اوپر جاتی ہیں۔ میں اوپر گئی تو بہو واقعی بستر پر نہیں تھی۔ اُس
[ک]ی جوتی اُس کی چارپائی کے ساتھ پڑی تھی۔ میرا بیٹا اسے دیکھنے کے لیے
[با]ہر نکل گیا۔ میں نے چھت پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ شاید کہیں کھیتوں
[می]ں نظر آ جائے۔ کسی سے پوچھتے بھی شرم آتی تھی۔ سورج نکلنے والا تھا،
[ج]ب گاؤں میں شور بپا ہو گیا کہ میری بہو ریلوے لائن پر کٹی پڑی ہے۔"

"وہ کام کاج کے وقت ننگے پاؤں رہتی تھی یا جوتی پہنے رکھتی تھی؟"
[خ]ان صاحب نے پوچھا۔ میں بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔

"وہ ننگے پاؤں رہنے کی عادی نہیں تھی"۔ اُس نے جواب دیا —
[گ]ھر میں کبھی جوتی اُتار دے تو اُتار دے۔ باہر جوتی پہن کر نکلا کرتی تھی۔"

خان صاحب آنکھیں بند کر کے کچھ سوچنے لگے۔ اچانک بیدار ہو گئے
[او]ر اس عورت کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ چلی گئی تو خان صاحب نے مجھے کہا۔
"مقتولہ کی جوتی اس کی چارپائی کے ساتھ پڑی تھی لیکن وہ ریلوے

لائن تک اپنے پاؤں پر چل کر نہیں گئی۔ میں نے لاش بڑی غور سے دیکھی تھی۔ اس کی ساس نے ٹھیک کہا ہے کہ وہ ننگے پاؤں چلنے کی عادی نہیں تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے پاؤں گندے اور بھدے ہوتے ہیں۔ یہ تو معمولی سی قسم کے کسان ہیں لیکن مقتولہ کے پاؤں صاف ستھرے تھے۔ اگر وہ ننگے پاؤں چل کر ریلوے لائن تک گئی ہوتی تو اس کے پاؤں ٹخنوں تک گرد سے اٹے ہوئے ہوتے۔ ان پر گرد کا نشان بھی نہیں تھا۔"

میں نے تو لاش دیکھی ہی نہیں تھی۔ خان صاحب اُن دانشمند تھانیداروں میں سے تھے جو لاش کو سر سے پاؤں تک دیکھتے ہیں۔ اکثر اوقات کوئی ایسا نشان یا اشارہ مل جاتا ہے جو تفتیش میں بہت مدد دیتا ہے۔ کبھی کبھی لاشیں خاموش زبان میں مجرم کی نشان دہی کر دیا کرتی ہیں۔ اس لاش نے ایسی ہی گواہی دے دی تھی۔ اب کڑیاں ملانا ہمارا کام تھا۔ تین چیزیں ہماری توجہ اور سوچ بچار کا مرکز بن گئیں۔ جوتی جو چھت پر پڑی رہی۔ سیڑھی جو مکان کے باہر یا پچھواڑے لگائی گئی تھی اور لاش کے پاؤں جو صاف ستھرے تھے۔

یہ تینوں چیزیں مقتولہ کے خاوند کے گرد گھومتی تھیں۔ ان معلومات کی روشنی میں واردات کا نقشہ یوں بنتا تھا کہ خاوند نے کسی وقت سیڑھی خود مکان کے باہر رکھی۔ شام کے بعد چھت پر بیوی کا گلا گھونٹ کر ہلاک کیا۔ لاش چارپائی پر پڑی رہنے دی۔ رات گاڑی کے وقت

سے پہلے لاش کندھوں پر اٹھائی اور صحن کی طرف والی سیڑھیوں سے اس ڈر سے نہ اترا کہ گھر والے جاگ اُٹھیں گے۔ اس مقصد کے لیے اُس نے مکان کے پیچھے یا پہلو کے ساتھ سیڑھی رکھی ہوئی تھی۔ اس سے اترا اور لاش ریلوے لائن رکھ آیا۔ مقتولہ کو یقیناً اٹھا کر لے جایا گیا تھا جس کا ثبوت یہ تھا کہ لاش کے پاؤں صاف ستھرے تھے ...... یہاں دو چیزیں پیشِ نظر رکھئے۔ دیہات کے مکان کچے ہوتے ہیں۔ بلندی بالکل معمولی۔ دوسری چیز یہ کہ گاؤں کے لوگ اتنے تھکے ہوتے ہیں کہ شام کا اندھیرا گہرا ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔

یہ امکان اب خارج از بحث تھا کہ مقتولہ خود چھت سے اتری اور ریلوے لائن پر لیٹ گئی۔ اگر ایسا ہوتا تو اُس کے پاؤں میں جوتی ہوتی یا اس کے پاؤں گرد آلود ہوتے۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ خاوند گہری نیند سویا رہا۔ ایک یا دو آدمی آئے۔ لڑکی کو اٹھایا اور چھت سے اتر گئے پھر اسے ہلاک کر کے ریلوے لائن پر رکھ دیا۔ لیکن یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق موت کا جو وقت بتایا گیا تھا۔ اس وقت کوئی آدمی جرأت نہیں کر سکتا کہ چھت پر چڑھ کر کسی کی بیٹی کو اٹھا لے جائے۔ اگر اسے زندہ اٹھا کر لے جایا جاتا تو اس پر مجرمانہ حملہ ضرور ہوتا۔ اگر یہ واردات ہوئی ہوتی تو مقتولہ کا خاوند اور اس کا باپ ضرور کسی پر شک کا اظہار کرتے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں ہے کہ ان پر ایسا سخت وار ہوتا کہ ان کے گھر کی

عورت کو ہی اُٹھا لے جاتے۔

دشمنی کی بجائے اس چھوٹے سے گاؤں میں اتفاق تھا۔ اتفاق بھی ایسا کہ خان صاحب کے مخبر کوئی راز کی بات نہ لا سکے۔ گاؤں میں چند گھر مقامی لوگوں کے تھے، باقی مہاجروں کے جو سب ایک ہی برادری کے تھے۔ مقامی اور مہاجر مل جل کر رہتے تھے لیکن دونوں اپنے کلچر، اور رسم و رواج اور رہن سہن کو ایک دوسرے سے بچانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا وہ ایک دوسرے کے گھروں کے اندر کی باتوں سے واقف نہیں تھے۔

پاکستان کی عمر ابھی چار سال تھی اور ان مہاجروں کو اس گاؤں میں آئے تین سال ہوئے تھے۔ مخبروں نے صرف یہ بتایا کہ مقتولہ کا باپ برادری کا سربراہ ہے اور برادری پر اس کا اتنا رعب ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی بات باہر نہیں نکل سکتی۔ مقتولہ اور اس کے خاوند کے چال چلن کے متعلق مخبر جو رپورٹیں لائے وہ اچھی تھیں مگر اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مقتولہ کو خاوند نے قتل کیا ہے یا اس قتل میں اس کا ہاتھ ضرور ہے۔ حیرت اس پر تھی کہ مقتولہ کا باپ اپنے داماد پر شک کا اظہار کیوں نہیں کرتا تھا؟ اور یہ سوال ہمیں پریشان کر رہا تھا کہ خاوند نے اپنی بیوی کو کیوں قتل کیا؟ اور کیا یہ ہو سکتا تھا کہ باپ بھی اپنی بیٹی کے قتل میں شامل یا رضامند تھا؟

لڑکی بھوکی تھی

میں نے اور خان صاحب نے سوچ بچار کر کے فیصلہ کیا کہ خاوند کے گھر کی تلاشی لی جائے اور اسے حراست میں لے لیا جائے۔ میں سیڑھی کو ذرا اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ قتل کے بعد کا دوسرا دن تھا۔ سورج غروب ہونے میں ابھی گھنٹہ بھر باقی تھا۔ ہم نے ان سب کو جنہیں تھانے بٹھا رکھا تھا، ساتھ لیا، چند ایک کانسٹیبل ساتھ لیے اور مقتولہ کے گاؤں چلے گئے۔ خاوند کی نشان دہی پر ہم اس کے گھر میں داخل ہوئے۔ میں نے سب سے پہلے اس کی ماں سے کہا کہ وہ سیڑھی مجھے دکھائے جو اُس کا بیٹا صبح کے وقت باہر سے اٹھا لایا تھا۔ سیڑھی صحن میں پڑی تھی۔ عجیب اوٹ پٹانگ سی سیڑھی تھی۔ اس میں بانس بھی تھا، درختوں کی ٹیڑھی اور موٹی دو خشک ٹہنیاں بھی اور تین ڈنڈے دیودار کے بھی تھے۔ کہیں سے موٹا کیل باہر نکلا ہوا اور مڑا ہوا تھا اور جو ڈنڈے درختوں کے تھے ان پر کئی کئی نوکیں تھیں۔

میں نے سیڑھی کو بڑی غور سے دیکھا اوپر سے نیچے والے دوسرے ڈنڈے اور لمبے (بازو والے) ڈنڈے کے درمیان دو بال اٹکے ہوئے تھے۔ زنانہ بال تھے کیونکہ لمبے تھے۔ ان سے میں نے ذہن میں یہ تصوّر قائم کیا مقتولہ کی لاش قاتل نے کندھے پر اس طرح اٹھائی کہ اس کا سر نیچے

ڈھلکا ہوا تھا یعنی لاش کا پیٹ قاتل کے ایک کندھے پر یا گردن کے پیچھے دونوں کندھوں پر تھا۔ سیڑھی سے اترتے لاش کے بال متوازی اور عمودی ڈنڈوں کے درمیان اٹک کر ٹوٹ گئے۔

یہ بال عدالت میں پولیس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تفتیش اور مجرم کی نشاندہی اور جرم کا پورا عمل سامنے لانے میں مدد دے سکتے تھے۔ اس دوران خان صاحب نے گھر کی تلاشی لے لی مگر کوئی کام کی چیز برآمد نہ ہوئی۔ انہوں نے خاوند کو ہتھکڑی نہ لگائی۔ اُسے کانسٹیبلوں کے حوالے کر کے تھانے بھجوا دیا۔ مقتولہ کی ساس کو الگ بلا کر اس سے ایسا سوال پوچھا جو ابھی میرے ذہن میں نہیں آیا تھا کیونکہ میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں پڑھی تھی۔ خان صاحب نے مقتولہ کی ساس سے پوچھا۔ — "جس رات تمہاری بہو گاڑی کے نیچے آئی اُس شام تمہاری یا تمہارے بیٹے کی اُس کے ساتھ لڑائی ہوئی تھی؟"

"نہیں جی!"

"تمہارے بیٹے نے شام کا کھانا کھایا تھا؟" — خان صاحب نے پوچھا۔

"کھایا تھا۔"

"گھر کے سب لوگوں نے کھانا کھایا تھا؟"

"سب نے کھایا تھا۔"

"تمہاری بہو نے کیوں نہیں کھایا؟" خان صاحب نے جواب کا انتظار نہ کیا تاکہ بڑھیا سنبھل نہ جائے۔ اس سے پوچھا — "تم نے اُسے کہا تھا کہ کھانا

کھا لو؟ تمہارے بیٹے نے اُسے کہا تھا کہ کھانا کھا لو؟ یا تم دونوں نے کہا تھا کہ نہیں کھاتی تو نہ کھائے۔ جائے بھٹے میں؟" بڑھیا کچھ گھبرائی مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی خان صاحب نے کہا — "میں تمہارے بیٹے کو پھانسی چڑھا دوں گا۔ سچ بتاؤ اُس نے روٹی کیوں نہیں کھائی تھی؟"

"میں نے سو بار کہا تھا کہ روٹی کھا لو۔" بڑھیا کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے — "مگر اُس نے نہ دوپہر کو روٹی کھائی نہ شام کو۔"

میں سمجھ گیا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ڈاکٹر نے معدے کی کیفیت لکھی ہو گی کہ خالی تھا۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو ذہین اور دانش مند تھانیدار خنجر کی طرح کپڑوں کے اندر چھپا کر رکھتے ہیں اور ایسے موقع پر استعمال کرتے ہیں جہاں اس کا وار مشتبہ یا ملزم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مقتولہ کے پاؤں کی کیفیت بھی ایسا ہی ایک خنجر تھا جو خان صاحب نے صحیح موقع پر استعمال کیا اور معدے کی کیفیت کا استعمال بھی وقت پر کیا۔ اس کے ساتھ ماں کو یہ دھمکی دے کر کہ اس کے بیٹے کو پھانسی چڑھا دیا جائے گا، خان صاحب نے ماں کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔

ماں نے اپنا سینہ کھول دیا اور بتایا کہ اُس روز اس کے بیٹے نے صبح صبح اپنی بیوی کو مارا تھا۔ ماں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وجہ کیا تھی۔ مقتولہ نے دوپہر کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا اور شام کو بھی بھوکی رہی تھی۔

خان صاحب کے اور میرے بہت سے سوالوں کے بعد یہ نئی بات معلوم

ہوئی کہ شام کو خاوند نے مقتولہ کو چھت پر لے جانا چاہا تو مقتولہ نے انکار کر دیا۔ خاوند اسے مزید مارنے پیٹنے کی بجائے بہلا پھسلا کر اوپر لے گیا تھا۔

ہمارا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ قاتل خاوند ہے اور ہم نے مقتولہ کے باپ کو بھی مشتبہ افراد کی فہرست میں رکھا۔ لڑکی یقیناً بدچلن تھی۔ باپ اس کی موت پر خوش تھا۔ یہ ہمارا خیال تھا۔ اس کے تحت ہم اسے بھی تھانے لے گئے۔ سیڑھی باقاعدہ کاغذی کارروائی سے قبضے میں لے لی۔ مقتولہ کا خاوند پہلے ہی تھانے بھیجا جا چکا تھا۔ ہم جب تھانے پہنچے تو رات اندھیری ہو چکی تھی۔ خان صاحب کے کانسٹیبل بڑے برخوردار تھے تھانے میں جا کر پتہ چلا کہ وہ پولیس کی روایات کے عین مطابق گاؤں سے چار مرغیاں پکڑ لائے ہیں۔ یہ مرغیاں سالم روسٹ کی گئیں۔ ہم نے نہا دھو کر کھائیں اور مقتولہ کے خاوند کو بلایا۔

خان صاحب نے اسے کہا۔ "اقبالی بیان دو گے یا میں مقدمہ قائم کر کے عدالت میں بھیج دوں۔ اس صورت میں ایسی شہادت پیش کر دوں گا جس سے تم سزائے موت سے نہیں بچ سکو گے۔ اقبالی بیان دے دو گے تو تمہیں پھانسی سے بچا لوں گا۔"

"کیسا اقبالی بیان؟" اس نے بڑے پختہ لہجے میں پوچھا۔ "میں نے کیا کیا ہے؟"

"اپنی بیوی کا قتل۔"

"آپ کا دماغ خراب ہو گیا ہے خان صاحب؟" ملزم نے نہایت

دلیری سے کہا۔ "حرام زادی نے خودکشی کی ہے۔ زندہ رہی تو مصیبت بنی رہی، مر گئی تو مجھے پولیس کے حوالے کر گئی۔"

لڑکی کا چلن مشکوک تھا

مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ آدمی پختہ کار ہے۔ آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گا۔ میں نے بھی اپنا پورا زور لگا دیا۔ اپنی لمبی سروس کا سارا تجربہ آزما دیکھا مگر اس نے ہر سوال کا جواب یہی دیا کہ مرنے والی کو قتل نہیں کیا گیا۔ اس نے خودکشی کی ہے۔ اس نے خودکشی کی وجہ یہ بیان کی۔ "میں اس سے تنگ تھا وہ مجھ سے تنگ تھی۔ میں اسے پیٹتا تھا۔"

خان صاحب نے غصے میں آ کر کہا۔ "ابھی اقبالی ہو جاتا ہے۔ میں مرچیں منگواتا ہوں۔" انہوں نے ایک کانسٹیبل کو آواز دی، لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ ہمارے پاس اقبالی بیان لینے کا ذریعہ موجود تھا۔ یہ تھرڈ ڈگری طریقہ تھا۔ مرچوں والا نسخہ عموماً کامیاب رہتا ہے لیکن میں اس کے خلاف تھا جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ یہ کوئی استادی نہیں تھی۔ ہم فخر سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہم نے ایسے قتل کی کامیاب تفتیش کی ہے جس کی کوئی شہادت نہیں تھی۔

دوسری وجہ یہ کہ اقبالی بیان کوئی ایسی دستاویز نہیں ہوتی جو قاتل کو سزا دلانے میں ضرور کامیاب ہو۔ اگر کوئی آدمی یہ لکھ دے کہ اس نے

فلاں آدمی کو قتل کیا ہے تو صرف اسی بیان پر قانون اسے سزا نہیں دے سکتا۔ دفعہ ۱۶۴ تعزیراتِ پاکستان کے تحت مجسٹریٹ کے سامنے دیا ہُوا بیان بھی اُس وقت تک بیکار ہوتا ہے جب تک کہ اس کے مطابق شہادت اور ثبوت موجود نہ ہو۔ پولیس کے لیے دو دستاویزیں بہت ہی نازک اور خطرناک ہُوا کرتی ہیں۔ ایک ہے ابتدائی رپورٹ جسے فسٹ انفارمیشن رپورٹ (ایف۔آئی۔آر) کہتے ہیں اور دوسرا اقبالی بیان۔ نااہل تھانیدار کی لکھی ہوئی ایف۔آئی۔آر اور بلاک ملزم کا دیا ہُوا اقبالی بیان عدالت میں پولیس کے کیس کو تباہ کر دیتا ہے۔

اس قتل کی واردات میں جہاں کوئی ٹھوس شہادت نہیں تھی نہ کوئی موقعہ کا گواہ تھا، اقبالی بیان لینا تفتیش میں سستی کرنے اور عدالت میں ملزم کو شک کا فائدہ دلوا کر بری کرانے کے مترادف تھا۔ چنانچہ میں نے خان صاحب کو مرچیں محفوظ رکھنے کا اشارہ کیا اور انہیں انگریزی میں کہا کہ میں مقتولہ کے باپ کو الگ لے جا کر لپیٹ میں لیتا ہوں اور آپ اسے جرح کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرتے رہیں۔ میں نے انہیں یہ کہا کہ آج رات نہ سوئیں گے نہ سونے دیں گے ... میں مقتولہ کے باپ کو باہر صحن میں لے گیا۔ میں اب ایک اور طریقہ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس شخص سے پوچھا — "تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری بیٹی کو تمہارے داماد نے قتل کیا ہے؟"

"قتل؟" — اُس نے حیران ہو کر کہا — "نہیں جی، مجھے تو یہ معلوم

ہے کہ میری بیٹی نے خودکُشی کی ہے۔"

"خودکشی کیوں کی ہے اُس نے؟" میں نے پوچھا۔

"خاوند اُسے بہت تنگ کرتا تھا۔"

"تمہیں یہ معلوم تھا کہ خاوند اُسے کیوں تنگ کرتا تھا؟ اس کے خاوند کو تم نے کبھی روکا کیوں نہیں تھا؟ کبھی پوچھا کیوں نہیں تھا کہ وہ اُسے کیوں تنگ کرتا ہے؟"

"میں تو اپنی بیٹی کو سمجھاتا رہتا تھا کہ بیٹی میری عزت کا خیال کرو اور خاوند کو خوش رکھو۔"

"اور جانتے ہو تمہارا داماد کیا کہہ رہا ہے؟" میں نے اپنا خصوصی حربہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کہتا ہے کہ میرا سُسر دھوکہ باز اور مکّار ہے۔ اس کی بیٹی شادی سے بہت پہلے بدکار تھی۔ وہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں میرا سُسر وارداتیں کیا کرتا تھا اور اپنی اس بیٹی کو رشوت کے طور پر تھانیداروں کے پاس بھیجا کرتا تھا۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اپنی بیٹی پٹواری کے پاس بھیج کر اس نے ایک آدمی کی زمین اپنے نام کرالی تھی اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ باتیں اُسے یہاں آ کر شادی کے بعد معلوم ہوئی ہیں۔ تمہارے داماد نے اقبالِ جُرم کر لیا ہے اور بیان دیا ہے کہ اُس نے بدکاری کی وجہ سے تمہاری بیٹی کو قتل کیا ہے۔"

معرکہ سُسر اور داماد کا

اس کا اثر وہی ہُوا جس کی مجھے توقع تھی۔ وہ بھڑک اُٹھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ غصّے سے اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ اُس کے منہ سے صرف ننگی گالیاں نکل رہی تھیں۔ وہ داماد کو وہیں قتل کرنے پر تیار ہوگیا۔ میں نے اُسے بٹھا دیا اور کہا کہ ذرا صبر کرو، میں ابھی تمہیں اس کے پاس لے جاؤں گا۔ میں اُسے پھانسی سے بچنے نہیں دوں گا۔ اُس نے تم جیسے عزّت دار آدمی پر تہمت لگائی ہے۔

اسے یوں ہمدردی کے جال میں پھانس کر اُس کمرے میں گیا جہاں خان صاحب نے مقتولہ کے خاوند کو بٹھا رکھا تھا۔ خان صاحب نے کہا۔ "ملک صاحب! یہ نہیں مانتا۔ مجھے دوسرا طریقہ اختیار کرنے دیں۔"

میں نے کہا "نہ مانے ہمیں پکّی گواہی مل گئی ہے۔ اس کے سُسر نے مجھے بتایا ہے کہ یہ شخص زانی اور چرسی ہے۔ اپنی بیوی سے بدکاری کرانا چاہتا تھا لیکن وہ نہیں مانتی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شہر جاکر یہ جوا کھیلتا تھا۔ میں اپنی عزّت کی وجہ سے خاموش تھا۔ میری اتنی نیک بیٹی کو یہ شہر لے جانا چاہتا تھا۔ وہ نہ مانی تو اسے قتل کر دیا اور اس کی لاش ریلوے لائن پر رکھ آیا۔"

ملزم کا رنگ سانولا تھا مگر غصّے سے یہ رنگ بالکل ہی بدل گیا۔ اُس

نے کہا۔ "کہاں ہے وہ بوڑھا؟" اُس نے گالیاں بکیں اور کہا۔ "ذرا اُسے یہاں لے آئیں خان صاحب!"

میں نے اس کی پیٹھ تھپکا کر کہا۔ "گھبراؤ نہیں جوان! ہم اُسے تمہارے سامنے لے آئیں گے لیکن عدالت میں۔ وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ تم چرسی، جواری اور رنڈی باز ہو، ایک درجن گواہیاں لا رہا ہے۔ اب ہمیں اقبالی بیان کی ضرورت نہیں۔ تمہارا جرم تمہارا سسر بیان کرے گا اور میں اپنے ہاتھوں تمہارے گلے میں پھانسی کا رسّہ ڈالوں گا۔"

یہ کہتے کہتے میں باہر نکل گیا۔ دو کانسٹیبلوں کو بلا کر ایک ہدایت دی اور مقتولہ کے باپ کو اندر بلا کر لے گیا۔ جب سسر اور داماد نے ایک دوسرے کو دیکھا تو بیک وقت مشین گنوں کی طرح پھٹ پڑے۔ داماد شیر کی طرح اٹھا۔ سسر اُس کی طرف لپکا۔ میں نے دو کانسٹیبل انہی کے لیے بلائے تھے۔ انہیں یہی ہدایت دی تھی کہ اگر یہ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑیں تو انہیں پکڑ لیں۔ کانسٹیبلوں نے انہیں پکڑ لیا۔ میں جانتا تھا کہ دیہاتیوں کو بھڑکانا بلکہ پاکستان کی مخلوق کو جسے عوام کہا جاتا ہے، بھڑکانا اتنا ہی آسان ہے جیسے آتش بازی کی ہوائی کے پیچھے انگارہ لگا دو تو وہ شُوں کر کے شرارے بکھیرتی آسمان پر جا پہنچتی ہے۔ ان دونوں کے پیچھے بھی میں نے ایک ایک انگارہ رکھ دیا تھا۔ وہ بیک وقت ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے۔ خان صاحب میری چال سمجھ چکے تھے۔ پولیس کے لیے یہ چال کوئی انوکھی نہیں تھی۔ کسی

واردات میں ملزم ایک سے زیادہ ہوں تو یہ طریقہ اکثر کامیاب رہتا ہے۔

ہم دونوں تماشائیوں کی طرح ان کی گالیوں اور لعنتوں کا تبادلہ سنتے رہے۔ ہمیں دل چسپی اپنے کام سے تھی۔ ان میں ایک یہ فقرہ بھی تھا جو داماد کے منہ سے نکلا۔ "تیری چھوڑی ہوئی بیٹی کو کوئی قبول نہیں کرتا تھا۔ اُسے میں نے قبول کیا۔"

سسر نے کہا۔ "او بے بھکاری، تجھے میں بیٹی نہ دیتا تو ساری عمر کنوارا رہتا۔"

تقریباً نصف گھنٹہ انہیں ٹکرا کر یہ انکشاف ہُوا کہ مقتولہ کی یہ دوسری شادی تھی۔ پہلے خاوند نے اُسے طلاق دے دی تھی کیونکہ اس نے ایک آدمی کے ساتھ آشنائی کر رکھی تھی۔ سُسر کو ہم نے باہر بھیج دیا۔ مقتولہ کے خاوند سے ہم نے اس نئے انکشاف کے مطابق سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اس سے اس کی تصدیق ہوئی کہ مقتولہ کی غیر مرد سے آشنائی کی وجہ سے طلاق ملی تھی۔ ملزم کو معلوم تھا۔ پھر بھی اس نے اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ مقتولہ کا باپ اس لیے ملزم کو بیوی کو مارنے پیٹنے سے نہیں روکتا تھا کیونکہ اُسے شک تھا کہ اس کی بیٹی نے ازسرِ نو کسی سے تعلقات پیدا کر لیے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کو ہی قصوروار سمجھتا تھا۔

میں نے خاوند سے پوچھا کہ کیا اس کی بیوی نے کوئی ایسی نازیبا حرکت کی تھی؟ خاوند نے وثوق سے بتایا کہ وہ پاک صاف رہی۔ اُس نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر میں نے پوچھا کہ وہ اُسے مارتا

پیٹتا کیوں تھا، اُس نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔ اب کے اُس نے یہ بھی کہا۔ "میں اس کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا۔ اس سے وہ بد دماغ ہو گئی تھی۔ اس نے گھر کا کام کاج چھوڑ دیا تھا۔"

"اب اقبالی بیان دو گے؟" خان صاحب نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"اپنے خدا پر یقین کریں خان صاحب! میں نے اسے قتل نہیں کیا۔" اس نے بدستور بڑے پختہ لہجے میں جواب دیا۔

میں نے اُسے سسر کی گواہیوں کی دھمکی دی تو اُس نے گالی دے کر کہا۔ "اُسے کہو لے آئے گواہیاں، مجھے سُولی پر کھڑا کر دو۔ ہاتھوں پر جلتے انگارے رکھ دو۔ میں یہی کہوں گا کہ میں نے بیوی کو قتل نہیں کیا۔"

میں نے پھر بھی خان صاحب کو مرچوں کے نسخے سے روک دیا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ مقتولہ کے پہلے خاوند اور اس کے آشنا کو بلاتے ہیں۔ خان صاحب نے اکتا کر کہا۔ "ملک صاحب! آپ تو ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں۔ آپ کو شغل مل گیا ہے۔ میں پندرہ منٹ میں اس سے اقبالی بیان لے لیتا ہوں۔ کل ۱۶۴ کا بیان کرا لوں گا۔" لیکن میں نہیں مانا۔ مجھے واقعی شغل مل گیا تھا۔ تفتیش اور سراغ رسانی کا مجھے چسکا تھا۔

اس کے علاوہ میں نے خان صاحب سے اس خیال کا بھی اظہار کیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی بیوی کو کوئی اور ہی اٹھا لے گیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ خاوند کی آنکھ لگتے ہی خود ہی پیچھے اتر گئی ہو اور اُسے آشنا نے مار ڈالا ہو۔ مگر خان صاحب نے میرے اس خیال کو رد کر دیا۔

البتہ میری یہ بات مان گئے کہ مقتولہ کے پہلے خاوند اور آشنا کو بلایا جائے۔

مقتولہ کے باپ نے بھی تسلیم کر لیا کہ اس کی بیٹی کو بدکاری کی وجہ سے طلاق ملی تھی۔ اس سے ہم نے اس کے پہلے داماد کا اتا پتہ پوچھا۔ وہ سات آٹھ میل دُور ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وقت دیکھا۔ صبح کے پونے چار بج رہے تھے۔ خان صاحب نے اُسی وقت اُسے بلانے کے لئے ایک کانسٹیبل کو روانہ کر دیا۔ مقتولہ کے خاوند کو ہم نے حوالات میں بند نہیں کیا۔ اُسے کانسٹیبلوں کے حوالے کر کے سونے کی اجازت دے دی۔ میں اور خان صاحب بھی سونے کے لیے چلے گئے۔

مقتولہ کا پہلا خاوند

اور آخری آشنا

ہم دس بجے تک سوئے اور گیارہ بجے تھانے میں چلے گئے۔

مقتولہ کا پہلا خاوند آیا ہُوا تھا۔ اُس سے مقتولہ کے متعلق پوچھا تو اُس نے یہ سن کر کہ وہ قتل ہو گئی ہے کہا۔ "اُسے خاوند نے قتل کیا ہوگا۔ میں نے اس پر رحم کیا تھا اور طلاق دے دی تھی۔"

اس سے صرف یہ پتہ چلا کہ ہندوستان (مشرقی پنجاب) کے ایک گاؤں میں اس کی شادی مقتولہ کے ساتھ دسمبر ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک رہی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ ہجرت کر کے پاکستان میں آ گئے۔

ہ سات مہینے ریفیوجی کیمپ میں رہے پھر اس گاؤں میں آ کر آباد ہو گئے۔

یہاں کچھ مقامی لوگ بھی تھے۔ ابتدا میں مہاجر کنبوں کو قدم م پر مقامی باشندوں کی محتاجی محسوس ہوتی تھی۔ مہاجر گھرانوں ے ان کی آبادکاری میں بہت مدد کی لیکن اس میل جول کا یہ اثر ہُوا مقتولہ نے ایک مقامی آدمی کے ساتھ ناجائز مراسم پیدا کر لیے۔ خاوند ِ پتہ چلا تو اس نے بیوی کو میکے بھیج دیا۔ اس کا میکہ اس گاؤں میں باد ہو چکا تھا جہاں اس کا دوسرا خاوند (ملزم) بھی آباد ہو گیا تھا۔ ں باپ نے لڑکی کو سمجھا بجھا کر خاوند کے پاس بھیج دیا مگر اُس نے ں آدمی سے ملنا نہ چھوڑا۔ آخر خاوند نے اسے طلاق دے دی۔

اس شخص سے کوئی اور بات معلوم نہ ہو سکی۔ میں نے قتل کے بعض بس اس قسم کے بھی دیکھے تھے کہ ایک آدمی نے بیوی کو کسی وجہ سے لاق دے دی اور جب اس عورت نے دوسری شادی کر لی تو پہلے اوند نے اسے قتل کر دیا۔ پکڑا گیا تو اس نے بیان دیا کہ میری عزت نے گوارا نہیں کیا کہ لوگ یہ کہیں کہ فلاں عورت اس آدمی کے گھر نہیں ہی، اب دوسرے آدمی کے ساتھ خوش ہے۔ ایسے قتل عموماً دیہات ں ہوتے ہیں لیکن اس شخص کے انداز اور باتوں سے مجھے ایسا کوئی ٹک نہیں ہُوا۔ اُس نے دوسری شادی کر لی تھی اور مطمئن تھا۔ میں نے اس سے مقتولہ کے آشنا کے متعلق پوچھ لیا اور فارغ کر دیا۔

اُسی وقت کانسٹیبل کو اس دوسرے آدمی کو بلانے کے لیے بھیج

دیا۔ اس دوران ہم دونوں، ملزم (مقتولہ کے دوسرے خاوند) کو جرح دھمکیوں اور لالچ سے قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ایسا پتھر نکلا جسے دو تھانیدار مل کر بھی نہ توڑ سکے۔ ہمیں ٹھوس شہادت کی ضرورت تھی جو ملزم کے سوا اور کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ خان صاحب نے یہ بھی سوچا کہ اس میں چونکہ کوئی شک نہیں کہ یہ ملزم اپنی بیوی کا قاتل ہے اس لیے بہتر ہے جھوٹے گواہوں کی خدمات حاصل کر لی جائیں۔ ہمارے مخبر ناکام ہو چکے تھے۔ مقتولہ کے باپ کے اثر و رسوخ سے جھوٹے گواہ آسانی سے مل جاتے جن میں سے ہم ایک دو کو عینی شاہد بھی بنا سکتے تھے۔

شام سے ذرا پہلے مقتولہ کا آشنا آگیا۔ اس سے مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ مقتولہ سے طلاق کے بعد ملتا رہا۔ ہمیں قتل کا باعث معلوم کرنا تھا۔ یہ شادی شدہ آدمی تھا۔ وجیہہ جوان تھا۔ عورتوں کے لیے اس میں کشش تھی۔ اس نے بالکل انکار نہیں کیا کہ مقتولہ کے ساتھ اس کی دوستی تھی۔ اس نے چھپانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مقتولہ کے اُس کے سوا کسی اور کے ساتھ تعلقات نہیں تھے اور وہ اس قماش کی تھی ہی نہیں۔ مہاجر جب ان کے گاؤں میں گئے تو اس آدمی نے ان کی بہت مدد کی۔ مقتولہ اور اس کے خاوند کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ وہ نیک نیتی سے اُن کی مدد کرتا تھا۔ ہل کے لیے اُس نے انہیں اپنے

مویشی بھی دے دیئے تھے۔ مقتولہ اس کے احسانات اور سلوک سے اتنی متاثر تھی کہ اس آدمی نے ایک روز بدنیتی کا اظہار کر دیا۔ مقتولہ نے اسے کہا کہ اس کے احسان چکانے کے لیے اس کے پاس اپنے آپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ وہاں سے ان کی خفیہ دوستی شروع ہو گئی۔ اُس کے خاوند کو پتہ چل گیا تو اس نے مقتولہ کو طلاق دے دی۔

دو گھنٹوں کی جرح میں ہمیں یہ آدمی صاف نظر آیا۔ کیس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اب ہمارے پاس مقتولہ کا خاوند رہ گیا تھا۔ مقتولہ کے باپ کو ہم نے گواہوں کی فہرست میں رکھ لیا اور اُسے کہا وہ شہادت مہیا کرنے میں ہماری مدد کرے۔ خان صاحب نے مقتولہ کے خاوند کو حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن شہر لے جا کر عدالت سے اس کا سات روز کا ریمانڈ لے لیا۔ مجھے خان صاحب نے اپنے پاس روک لیا۔ کہنے لگے کہ کیس تیار ہو جائے تو میں گھر جاؤں۔

اُسی روز قتل کے دو اور کیس آگئے۔ یہ خاندانی دشمنی کے کیس تھے۔ دن کے وقت دو پارٹیوں کی کھلی لڑائی میں یہ قتل ہوئے تھے۔ لمبی سی تفتیش کرنی تھی لیکن کام بہت تھا۔ خان صاحب تین روز ان میں مصروف رہے اور میں مقتولہ کے خاوند کو نرم کرنے یا شہادت یا ثبوت وغیرہ کے متعلق سوچتا رہا۔ کرتے کرتے ریمانڈ کا آخری دن آگیا۔ سات دن

کا مزید ریمانڈ لے لیا گیا مگر چار دن مزید گزر جانے کے باوجود ہمارے کام کی رفتار سست تھی۔ اس برادری میں اتنا سخت اتحاد تھا کہ کوئی بھی گواہی کے لیے تیار نہیں ہوتا تھا۔ مقتولہ کے باپ کا اثر اور رعب بے کار ثابت ہو رہا تھا۔

ہمیں بتایا گیا کہ دو آدمیوں نے مقتولہ کے باپ کو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر تمہارے داماد نے تمہاری بیٹی کو قتل کیا ہے تو اچھا کیا ہے۔ پہلے خاوند نے اُسے طلاق دی تھی، دوسرے نے قتل کر دی۔ وہ اسی قابل تھی۔ برادری میں بدکار عورت کو زندہ نہیں رہنا چاہیئے۔

اپنے خاوند کو زہر پلا دیا

اب تو میں قائل ہو گیا تھا کہ مرچوں اور پھینٹی والا نسخہ استعمال کیا جائے اور اگر یہ بھی ناکام رہے تو مقامی لوگوں سے گواہ لیے جائیں۔ قتل ہوئے تیرہ دن گزر گئے تھے۔ اُس رات ہمیں تھرڈ ڈگری والا طریقہ آزمانا تھا۔

دن کے چار بج رہے تھے کہ ایک سب انسپکٹر پولیس دفتر میں داخل ہُوا۔ خان صاحب اُسے اچھی طرح جانتے تھے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ میں اُسے نہیں جانتا تھا۔ اُس نے پچیس چھبیس میل دور کے ایک دیہاتی تھانے کا نام لے کر بتایا کہ وہ وہاں ایس۔ ایچ۔ او ہے اور وہ خان صاحب کے تھانے کے ایک آدمی کو شناخت اور شہادت کے لیے اپنے

ساتھ لے جانے آیا ہے۔

اُس نے جب اُس آدمی کا نام، ولدیت، ذات اور گاؤں بتایا تو میں اور خان صاحب بدک اٹھے۔ یہ آدمی خان صاحب کی حوالات میں بند تھا اور مقتولہ کا خاوند تھا جو اقبالی بیان دینے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ ہمیں جب پتہ چلا کہ وہ کسی اور کیس میں بھی ملوث اور مطلوب ہے تو ہم سمجھے کہ یہ پیشہ ور مجرم ہے، اسی لیے پولیس سے ذرّہ بھر نہیں ڈرتا مگر بات کچھ اور نکلی۔

سب انسپکٹر نے بتایا کہ اُس کے تھانے میں ایک عورت نے اپنے خاوند کو اس طرح زہر دیا ہے کہ وہ گھر آیا تو اُس عورت نے اسے پیالے میں دودھ ڈال کر دیا۔ خاوند نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ دودھ تھوڑا سا رہ گیا تھا کہ اُس نے اپنے اندر تلخی سی محسوس کی۔ اُس نے باقی دودھ رکھ دیا اور کہا کہ دودھ کا ذائقہ ٹھیک نہیں ہے اور میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا ہے۔ خاوند کو شک ہُوا۔ اُس نے اپنے بھائی کو بلا کر کہا کہ مجھے اس دودھ پر شک ہے۔ یہ دودھ اپنے قبضے میں رکھو۔ اُس کی بیوی نے اُس کے بھائی سے پیالہ چھیننے کی کوشش کی۔ اُس کے خاوند کی حالت تیزی سے بگڑنے لگی۔ وہ کہتا تھا کہ اندر آگ لگ گئی ہے۔

گاؤں کے سیانے کو بلایا گیا۔ اُس نے اُسے گھی میں کالی مرچیں ملا کر پلائیں۔ اُسے قے ہوئی مگر حالت اور زیادہ بگڑ گئی۔ گھر والوں نے اسے

چارپائی پر ڈالا اور شہر کی طرف دوڑ پڑے۔ شہر جو دراصل قصبہ تھا پانچ میل دُور تھا۔ وہ لوگ دودھ کا پیالہ جس میں تھوڑا سا دودھ تھا ساتھ ہی لے گئے۔ قصبے کے سرکاری ہسپتال میں پہنچے تو یہ آدمی ابھی زندہ تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو بیان دیا کہ اُسے بیوی نے دودھ دیا تھا جو پی کر اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ بیان دیتے دیتے وہ مرگیا۔ پولیس کو ہسپتال میں بلایا گیا۔ دودھ قبضے میں لے لیا گیا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کیا گیا معدے کے ٹکڑے اور اجزا اور دودھ لاہور کیمیکل ایگزیمینر کے معائنے اور رپورٹ کے لیے بھیج دیا گیا اور مقتول کی بیوی کو گرفتار کر لیا گیا۔

وہ عورت ذات تھی۔ عادی مجرم نہیں تھی۔ جذبات میں آکر خاوند کو زہر دے بیٹھی لیکن عین موقع پر پکڑی گئی اور جب تھانے میں آئی تو رو رو کر پاگل ہو رہی تھی۔ سب انسپکٹر نے کہا کہ رونا محض بیکار ہے، اقبالِ جرم کر لو۔ میں تمہیں بچانے کی کوشش کروں گا۔ اس نے ملزمہ کو ایسے انداز سے تسلّی دلاسہ دیا کہ تھانیدار کو وہ اپنا مونس و غمخوار سمجھ بیٹھی۔ اس نے اپنے جرم کی وجہ پوری تفصیل سے سنا دی۔ اُس نے اپنے خاوند کو اس آدمی کی خاطر زہر دیا تھا جس نے اپنی بیوی کو قتل کر کے اُس کی لاش ریلوے لائن پر رکھ دی تھی۔ ہم سمجھ گئے کہ اس نے بیوی کو کیوں قتل کیا ہے۔ سب انسپکٹر نے اس عورت کا اقبالی بیان مختصر کر کے سنایا تو میں نے اُسے کہا کہ یہ آدمی اپنی بیوی کے قتل میں اس حوالات میں بند ہے مگر اقبالی بیان نہیں دے رہا۔ میں نے کہا کہ اُسے

حوالات سے نکال کر یہاں لے آتے ہیں۔ اس کے سامنے مکمل اقبالی بیان جو اس عورت نے دیا ہے سنایا جائے۔

ملزم کو حوالات سے نکال کر کمرے میں لایا گیا۔ سب انسپکٹر نے اس سے پوچھا۔ "تم فلاں ولد فلاں ذات فلاں اور فلاں گاؤں کے ہو؟" — اُس نے جواب دیا — "جی!"

اُس نے خاوند کی قاتلہ کا نام لے کر پوچھا کہ اسے جانتے ہو؟ ملزم نے دبی سی زبان میں لاعلمی کا اظہار کیا۔

سب انسپکٹر نے پوچھا — "مشرقی پنجاب کے فلاں گاؤں میں تم نے اس کے ساتھ شادی نہیں کی تھی؟ نکاح فلاں مولوی نے نہیں پڑھایا تھا؟ وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی گاؤں میں آکر آباد ہوا ہے، جہاں تمہاری پہلی بیوی رہتی ہے۔"

"ہاں" اُس نے خان صاحب سے مخاطب ہو کر جواب دیا۔ "میں اُسے جانتا ہوں لیکن میں نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا۔"

"تم نے قتل کیا ہے یا نہیں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔ "اُس نے اپنے خاوند کو زہر دے کر قتل کر دیا ہے۔ پکڑی گئی ہے اور اُس نے اقبالی بیان دے دیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اس نے تمہاری خاطر خاوند کو زہر دیا ہے۔"

یہ سُن کر اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے سب انسپکٹر سے کہا کہ اسے ملزمہ کا سارا اقبالی بیان سنا دو۔ میں نے ملزم کا سر اوپر اٹھایا اور کہا —

"اچھی طرح سے سنو"۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

سب انسپکٹر نے سنایا کہ ملزمہ بڑی اچھی شکل وصورت کی جوان عورت ہے۔ اُس نے یہ اقبالی بیان دیا ہے کہ مشرقی پنجاب (ہندوستان) میں ملک کی تقسیم سے ایک سال پہلے اُس کی شادی اِس ملزم کے ساتھ ہوئی تھی مگر اس شادی میں نہ ملزمہ کے والدین رضامند تھے نہ ملزم کے، کیونکہ ملزمہ کی ذات ملزم کی ذات سے نیچے سمجھی جاتی تھی۔ ملزم اونچی ذات کا ہے۔ ان کی شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ہندوستان میں ملزمہ کا گاؤں ملزم کے گاؤں سے بارہ چودہ میل دور تھا۔ ان کی ملاقات ایک خانقاہ کے عرس پر اس طرح ہوئی تھی کہ ملزمہ بھیڑ میں اپنی ساتھی عورتوں سے بچھڑ گئی تھی اور باد و باراں کا ایسا طوفان آیا تھا کہ عرس پر جو ہزاروں زائرین گئے ہوئے تھے بُری طرح بھاگنے اور پناہیں ڈھونڈنے لگے۔ ملزم نے ملزمہ کو اکیلے دیکھ کر اس کی مدد کی۔ اُسے اپنے ساتھ ایک جگہ چھپا لیا۔ ملزمہ اپنی ساتھی عورتوں سے بچھڑ کر بہت پریشان تھی۔ طوفان سے وہ خوفزدہ ہو گئی۔ وہ کنواری لڑکی تھی۔ روتی پھرتی تھی۔ ملزم نے اُسے پناہ میں لے کر سنبھال لیا۔ یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ طوفان کا زور تین چار گھنٹوں بعد تھما۔ ملزم نے ملزمہ کو ساتھ لیا اور اُسے اُس کے گاؤں کی عورتیں بڑی مشکل سے تلاش کر دیں۔ ملزمہ کو یہ آدمی اس لیے بھی اچھا لگا کہ اس نے اس کی مدد کی تھی اور ویسے بھی یہ اُسے پسند آ گیا۔ ملزمہ کے بیان کے مطابق پہلی ملاقات میں ہی انہوں نے پھر ملنے کا وعدہ کر لیا۔

اس کے بعد یہ اس طرح ملتے کہ یہ ملزم بارہ چودہ میل کا سفر طے کر کے ملزمہ کے گاؤں میں سے گزرتا اور ملزمہ اُسے دیکھ کر ایک خاص جگہ پہنچ جاتی۔ چند ایک ملاقاتوں کے بعد انہوں نے یہاں تک طے کر لیا کہ ملزمہ گھر سے بھاگ آئے گی اور ملزم اس کے ساتھ شادی کر لے گا حالانکہ ملزم کی منگنی برادری کی ایک لڑکی کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اُس نے اپنے والدین سے کہا کہ وہ منگنی منسوخ کر دیں لیکن برادری کا قانون بڑا سخت تھا۔ ملزم نے دلیری کر کے اعلان کر دیا کہ وہ اس لڑکی ساتھ شادی نہیں کرے گا۔

ایک رات لڑکی گھر سے بھاگ آئی۔ ملزم اس کے گاؤں کے قریب مقررہ جگہ پر کھڑا تھا۔ وہ لڑکی کو اپنے گاؤں میں لے آیا اور اپنے ایک دوست کے گھر رکھا۔ برادری ملزمہ کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھی۔ ملزم نے برادری سے کہا کہ وہ اس گاؤں سے ہی نکل جائے گا۔ ملزم کے والدین کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ان کا جوان بیٹا ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے۔ بہت تکرار اور بحث مباحثہ کے بعد اُن کی شادی کرا دی گئی لیکن گاؤں میں دونوں کو اچھوت قرار دے دیا گیا۔ ملزمہ کے گھر والوں کو پتہ چل گیا کہ ان کی بیٹی کہاں ہے۔ وہ کمزور لوگ تھے۔ گاؤں کی اونچی ذات کے دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر

ملزم کے گاؤں گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ اُن کی بیٹی نے باقاعدہ شادی کر لی ہے۔ وہ بیٹی سے ناراض ہو کر چلے گئے۔

تقریباً چھ مہینے بعد ملزمہ کے والدین نے اس کی خطا معاف کر دی اور اُسے اپنے خاوند کے ساتھ گھر آنے کی اجازت دے دی۔ وہ خاوند کے ساتھ اپنے گاؤں گئی۔ والدین اور گھر والوں نے اُن کی آؤ بھگت کی۔ اس کے بعد وہ دو دفعہ اپنے گاؤں گئی۔ تیسری بار وہ گاؤں گئی تو یہ ۱۹۴۷ء کے وہ دن تھے جب مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو چکا تھا۔ ملزم اپنے گاؤں میں تھا، ملزمہ اپنے گاؤں میں۔ ملزمہ کے گاؤں پر سکھوں نے حملہ کیا لیکن ملزمہ کا کنبہ ایک ہی روز پہلے گاؤں کے چند اور لوگوں کے ساتھ ہجرت کر چکا تھا اور ابھی راستے میں تھا۔ بہت سی مشکلات کا مقابلہ کرتے یہ لوگ پاکستان میں آگئے اور والٹن (لاہور) کے ریفیوجی کیمپ میں چلے گئے جہاں ملزمہ کو ملزم کی ساری برادری مل گئی۔

ملزم کا باپ سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا تھا۔ ملزمہ نے اپنے خاوند کے متعلق پوچھا۔ اسے بتایا گیا کہ وہ نہیں آیا۔ ملزم کے گاؤں پر بھی حملہ ہوا تھا۔ اس وقت ملزم گاؤں میں نہیں تھا۔ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ گاؤں والے وہاں سے ہجرت کر آئے اور لاہور کے والٹن ریفیوجی کیمپ میں پہنچ گئے۔ انہوں نے سارے کیمپ میں اُسے ڈھونڈا۔ ہر روز نئے قافلوں میں اُسے ڈھونڈتے مگر اس کا کہیں اتا پتہ نہ ملا۔ اب ملزمہ

کیمپ میں آگئی تو یہ بھی اُسے ڈھونڈنے لگی مگر سارے لاہور کے اندر، مضافات میں اور کیمپ میں لاکھوں مہاجرین میں کسی کو تلاش کرنا ناممکن تھا۔

ایک روز ان کے قریب کے ایک گاؤں کا ایک آدمی کیمپ میں آیا۔ اُس کے خاندان کے بہت سے آدمی شہید ہو گئے تھے۔ اس نے ملزم کے متعلق پکی اطلاع دی کہ وہ پاکستان کے راستے میں مارا گیا ہے اور اُس نے اُس کی لاش دیکھی ہے.... اُس نے نشانیاں بتائیں اور ثابت کر دیا کہ ملزم سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے.... پھر تین ساڑھے تین سال گزر گئے۔ اس عرصے میں ملزم کی برادری اُس گاؤں میں آباد ہو گئی اور ملزمہ کا خاندان اس گاؤں میں آباد ہو گیا لیکن ملزمہ کو یہ علم نہیں تھا کہ اس کے خاوند (ملزم) کا خاندان کہاں آباد ہوا ہے۔ اس عرصے میں ملزمہ کی دوسری شادی بھی کر دی گئی۔ وہ ملزم کو یاد کر کر کے روتی رہتی تھی۔ اس کے گھر والوں نے اور دوسرے لوگوں نے اُسے سمجھا سمجھا کر اس کی شادی کرا دی۔ ملزمہ کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ اس کا خاوند شہید ہو گیا ہے۔

ایک بیوی کے دو خاوند اور زہر کا پیالہ

دوسری شادی کے ایک سال بعد کا ذکر ہے کہ ملزمہ اپنے خاوند کے ساتھ پاکستان کے کسی مرحوم پیر کے عرس پر گئی۔ یہ لوگ پیر پرست تھے مشرقی پنجاب میں بھی عرسوں پر جاتے تھے۔ پاکستان میں بھی انہیں پیر، مزار اور

عرس مل گئے۔ ملزمہ نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ وہ اپنے دوسرے خاوند کے ساتھ عرس پر گئی تو وہاں اسے پہلا خاوند نظر آیا۔ وہ نظر کا دھوکا سمجھی لیکن وہ واقعی اس کا پہلا خاوند تھا۔ ملزمہ نے اپنے دوسرے خاوند کو کھانے کی کوئی چیز لانے کے لیے بھیج دیا تاکہ اپنے پہلے خاوند کے ساتھ آزادی سے باتیں کر سکے۔ دوسرا خاوند عرس کی بھیڑ میں غائب ہو گیا تو ملزمہ اس ملزم سے ملی۔

ملزم اس کا پہلا خاوند ہی نہیں تھا بلکہ یہ دلوں کا سودا تھا۔ ان دونوں نے محبت کی خاطر اپنے والدین اور برادریوں سے دشمنی مول لے لی تھی۔ دوسرا خاوند دلوں کے رشتے کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ ملزمہ نے ملزم کو اگلی ملاقات کے لیے ایک جگہ بتا دی اور جدا ہو گئے۔ ملزمہ نے اپنے اقبالی بیان میں اپنی جذباتی حالت بیان کرتے ہوئے کہا کہ اسی وقت سے وہ اپنے دوسرے خاوند کو ایسا غیر آدمی سمجھنے لگی جس نے اسے زبردستی اپنا قیدی بنا رکھا ہو۔ اس نے دل کو سمجھا لیا تھا کہ پہلا خاوند مر گیا ہے۔ اُس نے دوسرے خاوند کو قبول کر لیا تھا مگر پہلے خاوند کو دیکھتے ہی اس کا دماغ پھر گیا۔ وہ گھر میں خاموش رہنے لگی مگر روتی نہیں تھی۔ یہ سوچتی رہتی تھی کہ وہ دوسرے خاوند سے طلاق کس طرح لے اور اپنے پہلے خاوند کے پاس کس طرح پہنچے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ اس کا پہلا خاوند (ملزم) بھی شادی کر چکا تھا۔

تین چار روز بعد ملزم پچیس میل کا فاصلہ طے کر کے ملزمہ کی بتائی

ہوئی جگہ پر چلا گیا۔ ملزمہ آ چکی تھی۔ اُس روز ان کی باتیں تفصیل سے ہوئیں۔ ملزمہ نے اُسے بتایا کہ کس طرح وہ اُسے ڈھونڈتی رہی ہے اور کس طرح اُسے اطلاع ملی تھی کہ ملزم سرحد پار مارا گیا ہے اور کس طرح اس گاؤں میں آ کر اُس کی شادی کی گئی۔ ملزم نے اسے بتایا کہ جب سکھوں کے حملے شروع ہو گئے تو اُس کے گاؤں کے لوگ پاکستان کی طرف روانہ ہو گئے لیکن وہ ملزمہ کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔ وہاں رات کو پہنچا جب گاؤں کا صفایا ہو چکا تھا۔ صبح کے وقت وہ پاکستان کی راہ پر روانہ ہو گیا۔ آدھے راستے میں اُسے ملزمہ کے گاؤں کا ایک آدمی مل گیا۔ اس نے ملزم کو بتایا کہ ملزمہ کو سکھ لے گئے ہیں۔ یہ ایک غلط فہمی تھی۔ ملزم نے ملزمہ کو ملاقات پر بتایا کہ وہ وہیں سے واپس چلا گیا اور ملزمہ کو ڈھونڈتا رہا۔ ایک سکھ دوست نے اس کی مدد کی۔ آخر اس سکھ نے اسے پاکستان چلے جانے پر مجبور کیا اور وہ دل پر پتھر رکھ کر ادھر آ گیا۔

پاکستان میں آ کر وہ ملزمہ کے خاندان کو ڈھونڈتا رہا۔ اس دوران اُسے لاہور میں اپنی برادری کا ایک آدمی مل گیا۔ اس وقت تک ایک سال گزر گیا تھا۔ یہ آدمی ملزم کو اس گاؤں میں لے گیا جہاں وہ آباد ہو گیا تھا۔ ملزم کو برادری کے چار پانچ آدمیوں نے یقین دلا دیا کہ ملزمہ ماری گئی ہے اور اس کے خاندان کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ شاید سب مارے گئے ہیں۔ یہ حقیقت بعد میں کھلی تھی کہ یہ ایک سازش تھی۔ ملزم کے دل سے ملزمہ کا نام صاف کرنے اور برادری میں اس کی دوسری شادی

کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولا گیا تھا کہ ملزمہ ماری گئی ہے۔ اس جھوٹ کے بعد ملزم کی شادی کر دی گئی۔

ملزمہ نے بیان میں کہا کہ "۔۔۔ جب یہ پتہ چلا کہ ملزم کو اس کی موت کی جھوٹی خبر سنا کر اس کی شادی کی گئی ہے تو اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے کیمپ میں یہ جو اطلاع دی گئی تھی کہ ملزم کو سکھوں نے قتل کر دیا ہے، جھوٹ تھا اور یہ جھوٹ دونوں برادریوں نے کیمپ میں مل کر گھڑا تھا۔ اس خیال نے اسے بھڑکا دیا۔ ملزم بھی بھڑک اٹھا۔ دونوں نے یہ طے کیا کہ ملزم اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا اور ملزمہ اپنے خاوند سے طلاق لے لے گی مگر دیہاتی معاشرے میں طلاق لینا اور دینا ناممکن ہوتا ہے۔ لاٹھیاں اور کلہاڑیاں چلتی ہیں۔ سر کھل جاتے ہیں۔ پھر موت، جیل یا پھانسی کا تختہ میاں بیوی کو جدا کرتا ہے۔ ملزم اور ملزمہ نے یہ طے کیا اور اگلی ملاقات کا دن مقرر کر کے جدا ہو گئے۔

اگلی ملاقات میں ملزمہ نے ملزم کو بتایا کہ اس نے خاوند کو صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ وہ اسے طلاق دے دے لیکن وجہ نہیں بتائی تھی۔ خاوند نے اسے بہت مارا پیٹا اور وجہ پوچھی۔ ملزمہ نے یہ وجہ بتائی۔ "میں اپنے پہلے خاوند کو دل سے نہیں اتار سکتی اور میں تمہیں دھوکا نہیں دینا چاہتی۔"

خاوند نے اسے خانقاہوں اور مزاروں پر لے جانا شروع کر دیا اور ایک پیر سے تعویذ لا کر اس کے گلے میں باندھ دیا۔ ملزمہ نے اپنے اقبالی بیان میں یہ الفاظ قلم بند کرائے ۔۔۔۔ "لیکن میرا پیر استاد یہ آدمی تھا جس کی خاطر میں طلاق لینا چاہتی تھی، مجھ پر اب کوئی تعویذ اثر نہیں کر سکتا۔"

یہ ملزمہ کے جذبات کی شدت کی انتہا تھی، ورنہ دیہاتی لوگ خدا اور رسولؐ کی بجائے پیروں اور خانقاہوں کو زیادہ مانتے ہیں۔۔۔۔ ملزم نے اسے بتایا کہ اس نے اپنی بیوی کو کہہ دیا ہے کہ وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے لیکن بیوی کہتی ہے کہ وہ اسی کے گھر میں زہر کھا کر مر جائے گی۔

اس کے بعد وہ ملتے رہے اور ایک دوسرے کو بتاتے رہے کہ ان کے گھروں اور گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔ ملزمہ نے اپنے خاوند کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی تھی۔ خاوند اسے مارتا پیٹتا تھا۔ جذبات اور جہالت نے ان کی عقل پر قبضہ کر لیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ملزمہ اپنے خاوند کو اور ملزم اپنی بیوی کو قتل کر دے۔ انہوں نے قتل کا دن مقرر کر لیا اور طے کیا کہ قتل کے دو روز بعد وہ اسی جگہ ملیں گے اور جب قتل کی تفتیش مکمل ہو جائے گی تو وہ ایسا ڈرامہ کھیلیں گے کہ لوگوں کے سامنے اس طرح ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے جیسے اچانک اور اتفاقیہ آمنا سامنا ہو گیا ہو۔ پھر ان کی دوبارہ شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو گی۔ دونوں برادریاں اس وجہ سے کوئی اعتراض نہیں کریں گی کہ یہ تو پہلے ہی میاں بیوی تھے اور اتفاق سے پھر اکٹھے ہو گئے ہیں مگر ان جاہلوں کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسے اتفاق کو معجزہ کہا کرتے ہیں اور معجزے کسی قتل کر کے نہیں کیے جاتے۔ ان بدبختوں کو یہ امید تھی کہ لوگ اس عجیب و غریب اتفاق پر غور ہی نہیں کریں گے کہ "اتفاق سے" وہی خاوند قتل ہوا

جس سے بیوی طلاق لینا چاہتی تھی اور وہی بیوی قتل ہوئی جسے خاوند طلاق دینا چاہتا تھا اور اتفاق ایسا ہوا کہ طلاق لینے اور دینے والے میاں بیوی ایسے نکلے جو دوسری شادیوں سے پہلے میاں بیوی تھے اور پھر سے میاں بیوی بن گئے۔ اگر یہ اردو یا پنجابی کی پاکستانی فلم ہوتی تو پولیس کے ملازم بھی کہتے کہ واہ واہ بڑی اچھی سٹوری ہے مگر یہ کہانی جب حقیقی رنگ میں پولیس کے سامنے آئی تو اس میں نہ خوبصورتی تھی نہ عقل۔ یہ جذبات اور جہالت کا بڑا ہی بھونڈا کھیل تھا۔

ملزمہ نے عین اُس روز خاوند کو دودھ میں زہر ملا کر پلا دیا جس شام ملزم نے بیوی کا گلا گھونٹ کر اُس کی لاش ریلوے لائن پر رکھی تھی مگر وہ رل نہ سکے۔ ملزمہ عین موقعہ پر پکڑی گئی اور ملزم کو میں نے اور خان صاحب نے لپیٹ میں لے لیا۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی کارگزاری کا بالکل علم نہیں تھا۔ البتہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق انہوں نے اپنا اپنا کام کر دیا تھا۔ ملزمہ نے اقبالی بیان ایسی خوفزدگی کی حالت میں دیا تھا کہ اس نے کچھ بھی نہیں چھپایا۔ قتل ایسا جرم ہے جو پیشہ ور قاتل کرتے ہیں تو کئی کئی دن جذباتی لحاظ سے سنبھل نہیں سکتے۔ اس قدر چرس یا شراب پیتے ہیں کہ اپنے آپ کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ قاتل کو سکون صرف اقبالِ جرم سے ملتا ہے یا پھانسی کے تختے پر۔ یہ تو دیہاتی لڑکی تھی۔ اس نے فوراً اقبالِ جرم کر لیا اور یہاں تک بتا دیا کہ اُس نے گاؤں کے ایک مجذوب سی قسم کے حکیم سے زہر حاصل

کیا تھا لیکن قیمت پیسوں کی شکل میں نہیں بلکہ اپنے جسم کی شکل میں دی کیونکہ حکیم کا مطالبہ ہی یہی تھا۔

اس بدکار خود ساختہ حکیم نے چھ بار اس لڑکی کو ہوس کاری کا نشانہ بنا کر زہر دیا تھا مگر لڑکی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ دودھ میں زہر کی مقدار کتنی ڈالے تاکہ وہ فوراً نہ مر جائے۔ لڑکی نے ساری پڑیا دودھ میں ڈال دی جس نے پیٹ میں جاتے ہی اثر دکھا دیا۔ خاوند نے کچھ دودھ چھوڑ دیا اور لڑکی پکڑی گئی۔ لاہور سے معدے کے اجزا اور دودھ کی رپورٹ آ گئی۔ دودھ اور معدے میں سنکھیا پایا گیا۔ پولیس نے حکیم کو بھی گرفتار کر لیا تھا اور اُس کے گھر کی تلاشی لے کر سنکھیا کی کچھ اور مقدار، چرس، افیون اور اوٹ پٹانگ دوائیاں قبضے میں لے لی تھیں۔ لوگ اسے سیانا کہتے تھے۔

سب انسپکٹر ملزمہ کا اقبالی بیان زبانی سنا رہا تھا تو ہمارے ملزم کے آنسو جاری تھے۔ کبھی وہ سر جھکا لیتا اور کبھی سب انسپکٹر کا منہ ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا۔ جب سب انسپکٹر بات ختم کر چکا تو ملزم نے خان صاحب سے کہا۔ "خان صاحب! میرا بیان لکھ لیں۔ میں نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے"۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "صرف ایک عرض کرتا ہوں کہ ایک بار مجھے اُس سے ملوا دیں اور اگر آپ کے اختیار میں ہے تو ہم دونوں کو ایک ہی تختے پر کھڑا کر کے پھانسی دینا"۔ یہ کہتے کہتے وہ

دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے پگڑی کے پلّو سے آنکھیں صاف کیں اور پانی مانگا۔ ہم نے اُسے پانی پلایا اور تھانہ صاحب نے اس کے لیے اپنے گھر سے کھانا منگوایا۔ ابھی ابھی وہ رو رہا تھا، لیکن اُس نے سکون کی آہ بھر کر اور مسکرا کر کہا ــ "آپ نے اتنے دل گردے اور اتنی پکّی زبان کی عورت کبھی دیکھی ہے؟ یہ بھی سوچو کہ وہ نیچ ذات کی ہے۔ اونچی ذات کی ہوتی تو ایسی دلیری کبھی نہ کرتی۔ پہلے خاوند کو بھول کر دوسرے کے ساتھ مست ہو جاتی"۔

ہم نے ان دونوں کی دلیری کی بہت تعریف کی۔

اُس نے پورے اطمینان سے اقبالی بیان دینا شروع کر دیا جو ساڑھے تین گھنٹوں میں ختم ہوا۔ یہ سارے کا سارا بیان سنانے کی ضرورت نہیں۔ جرم کا آدھا پس منظر تو آپ ملزمہ کے اقبالی بیان میں سُن چکے ہیں۔ اس میں جو باتیں اور واقعات ملزم سے متعلق تھے اور ملزمہ کو معلوم نہیں تھے، وہ ملزم کی زبانی سُن لیجئے۔ اُس نے اس کی تصدیق کی کہ ملزمہ کے ساتھ اُس کی پہلی ملاقات عُرس کے موقعے پر طوفان میں ہوئی تھی۔ لڑکی اپنے گاؤں کی عورتوں سے بچھڑ گئی تھی۔ طوفان بڑے زور کا تھا۔ لڑکی کے پاؤں اکھڑ رہے تھے۔ وہ رو رہی تھی۔ ملزم نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ ملزمہ ڈرے ہوئے بچے کی طرح اس کے ساتھ چپک گئی تھی۔ وہ اسے ایک مکان کے پچھواڑے لے گیا اور اُسے تسلّی دلاسہ دے کر اس کا حوصلہ قائم کر دیا تھا۔ اُس نے ملزمہ کے ساتھ کوئی

ناروا بات نہیں کی تھی، نہ اُس کے دل میں کوئی بدنیتی تھی۔ وہ اُس کی پناہ میں تھی۔ البتہ لڑکی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے سے گاؤں کے نام پوچھے تھے۔

وہ بہت دیر تک وہاں بیٹھے رہے تھے۔ اس دوران ان کی اجنبیت اپنائیت میں بدل گئی اور یہ اپنائیت اتنی بڑھی کہ انہوں نے ملنے کے وعدے کر لیے۔ ملزمہ کے بیان کے مطابق ملزم نے بھی کہا کہ وہ اُسے ملنے جاتا رہا۔ ملزم نے قرآن کی قسم کھائی کہ انہوں نے محبت کو ناپاک نہیں ہونے دیا کیونکہ انہوں نے فوراً ہی شادی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لڑکی نے اُس سے ایک روز پوچھا کہ ذات کے اتنے بڑے فرق کا کیا علاج کرو گے تو ملزم نے کہا تھا کہ تم قائم رہنا، میں جو کچھ کروں گا وہ ساری دنیا دیکھے گی۔

تھوڑے دنوں بعد ان دونوں نے جو کچھ کیا وہ ساری دنیا نے دیکھا۔ لڑکی کی یہ قربانی معمولی نہیں تھی کہ وہ گھر سے بھاگ آئی۔ ملزم کی قربانی یہ تھی کہ برادری نے اس کا حقہ پانی بند کرنے یعنی سوشل بائیکاٹ کرنے کی دھمکی دی اور جن کی لڑکی کے ساتھ اُس کی منگنی ہو چکی تھی، انہوں نے اسے قتل کی دھمکی دی۔ یہ دھمکی پوری بھی ہو سکتی تھی لیکن ملزم نے بھرے گاؤں میں کھڑے ہو کر اُن کے چیلنج کو قبول کیا۔ یہ دلیری غیر معمولی تھی۔ دیہات میں انہی باتوں پر خون خرابے ہوا کرتے ہیں۔

ملزم کو کسی نے قتل تو نہ کیا لیکن اس کے ساتھ برادری نے بول چال بند کر دی اور اس کے ساتھ اور اس کی بیوی (ملزمہ) کے ساتھ اچھوتوں کا

سا سلوک کیا۔ مثلاً پہلی بار وہ گاؤں کے کنوئیں پر پانی پینے گئی تو عورتوں نے اُسے کنوئیں کے قریب بھی نہ جانے دیا۔ وہ خالی گھڑا لے کے واپس آگئی۔ اُس کے بعد ملزم خود کنوئیں سے پانی لاتا رہا۔۔۔۔ پھر بائیکاٹ ختم ہو گیا۔ لڑکی اپنے گاؤں جانے لگی اور اگست ۱۹۴۷ء آگیا۔

مشرقی پنجاب میں آگ اور خون کا طوفان آگیا۔ اُس وقت ملزمہ اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کا خون بہہ رہا تھا۔ گھر لٹ رہے تھے، جل رہے تھے اور اُن کی لڑکیاں اغوا ہو رہی تھیں۔ یہ طوفان ملزم کے گھر میں بھی آگیا۔ گاؤں کے لوگ وقت سے پہلے نکل گئے مگر ملزم ملزمہ کے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ گاؤں کے کئی مکان جل رہے تھے۔ وہ گاؤں میں داخل ہوا تو وہاں چند ایک لاشوں کے سوا اُسے نہ کوئی انسان زندہ نظر آیا نہ کوئی مویشی۔ سکھ گاؤں کا صفایا کر گئے تھے۔

وہ پاگلوں کی طرح ملزمہ کے گھر میں داخل ہوا۔ گھر خالی تھا۔ یہ کچا سا اور غریبانہ مکان تھا۔ وہاں کوئی لاش نہیں تھی۔ اُس نے ماچس جلا کر دیکھا۔ وہاں اُسے خون بھی نظر نہ آیا۔ گاؤں میں ڈرا دینے والی خاموشی تھی۔ اُس نے گاؤں کی گلیوں میں ملزمہ کو پکارنا شروع کر دیا۔ جہاں اُسے کسی لاش کے ساتھ ٹھوکر لگتی وہ ماچس جلا کر لاش کو غور سے دیکھتا۔ اُسے مختلف جگہوں پر تین جوان لڑکیوں کی برہنہ لاشیں نظر آئیں۔ اس نے چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھی لاشیں دیکھیں۔ بڑی عمر کے آدمیوں کی لاشیں بھی تھیں مگر یہ بہت زیادہ نہیں تھیں۔ ملزم نے یہ اندازہ لگایا کہ گاؤں کی بیشتر آبادی گاؤں

سے نکل گئی ہے۔ وہ گاؤں کے ہر ایک مکان میں گیا اور ملزمہ کی لاش ڈھونڈتا رہا مگر وہ اُسے نہ زندہ ملی نہ مُردہ۔

رات اسی تلاش میں گزر گئی۔ صبح کے وقت وہ پھر گاؤں کے ہر ایک مکان میں گیا۔ اُسے بڑا ہی بھیانک منظر نظر آیا۔ اُس نے جلے ہوئے مکانوں کے کھنڈروں میں جا کے دیکھا۔ اُسے ملزمہ کی لاش نہ ملی۔ گاؤں والوں کی اُس نے کئی لاشیں دیکھیں۔ ہار کر وہ گاؤں سے نکلا اور اپنے گاؤں چلا گیا۔ اُس گاؤں کو وہ صحیح حالت میں چھوڑ گیا تھا۔ وہاں بھی اب وہی تباہی تھی جو وہ ملزمہ کے گاؤں میں دیکھ آیا تھا۔

اُس نے اپنے بیان میں کہا کہ اپنے گاؤں میں گھومتے پھرتے اُسے ایسے لگ رہا تھا جیسے ملزمہ کے گاؤں میں گھوم پھر رہا ہو۔ اُسے اپنے گھر کے کسی فرد کی لاش نظر نہ آئی۔ اُس کا گھر خالی تھا اور لُوٹا ہوا۔ وہ گاؤں سے نکلا۔ اُسے دُور بہت سے لوگ جلوس کی صورت میں جاتے نظر آئے۔ وہ اُن کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے اپنے باپ کی لاش پڑی نظر آئی۔ اس کے جسم پر برچھیوں اور کلہاڑیوں کے بہت سے زخم تھے۔ اِدھر اُدھر گاؤں کے چند اور آدمیوں کی لاشیں پڑی تھیں اور ان میں دس بارہ سکھوں کی لاشیں بھی تھیں۔ ملزم نے بتایا کہ جب وہ پاکستان میں اپنے خاندان سے ملا تھا تو اُسے بتایا گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ گاؤں سے نکلے تو سکھوں نے اُن پر حملہ کر دیا تھا۔ سکھ بہت زیادہ نہیں تھے۔ گاؤں والوں نے سکھوں کو گھیر لیا اور جم کر لڑائی ہوئی تھی۔

ملزم ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف آرہا تھا۔ وہ ہر ایک آدمی اور ہر ایک عورت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند قدم آگے چلتا اور رُک جاتا۔ اپنے قریب سے گزرتے لوگوں کو دیکھتا اور وہ کبھی پیچھے کو چل پڑتا اور پناہ گزینوں کو دیکھتا جاتا۔ اس طرح اُس نے آگے کو کم اور پیچھے کو زیادہ فاصلہ طے کیا۔ یوں ہی لوگوں کو دیکھتے اور آگے پیچھے چلتے دن اور راتیں گزرنے لگیں۔ پناہ گزینوں کے قافلوں اور قطاروں میں کمی نہیں آرہی تھی۔

ملزم ہوش گم کیے وہیں کہیں پناہ گزینوں کو دیکھتا رہا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ کب اور کہاں اُسے جان پہچان کا ایک آدمی ملا۔ وہ ملزمہ کو جانتا تھا۔ اُس نے ملزم کو بتایا کہ ملزمہ کو سکھ اٹھالے گئے تھے۔ اس خبر نے اُسے باؤلا کر دیا۔ اُس کے پاس کلہاڑی تھی۔ وہ سکھّوں سے اپنی بیوی لانے کے لیے چل پڑا۔ وہ اب واپس جارہا تھا۔ اسے اردگرد کے ایسے گاؤں معلوم تھے جہاں صرف سکھ رہتے تھے یا جہاں اُن کی آبادی زیادہ تھی۔ ان دنوں سکھ ہر طرف بھیڑیوں کی طرح غرّاتے پھر رہے تھے۔ ملزم کو ایک سکھ مل گیا جو اُس کا ہم عمر تھا اور اُس کا دوست بھی۔ سکھ دوستی یاری بھول چکے تھے لیکن یہ سکھ اُن چند ایک سکھوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کے دلوں میں دوستی بھی زندہ تھی۔ اُس نے ملزم کو دیکھا تو اُسے گھبرا کر کہا کہ اپنا منہ اور سر پگڑی میں چھپالے تاکہ سکھ اُسے سکھ سمجھیں ورنہ وہ مارا جائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ سکھ نے اُسے اپنی کرپان دے دی اور اس کی کلہاڑی لے لی۔ کرپان سرٹیفکیٹ تھا کہ وہ سکھ ہے۔

ملزم نے سکھ دوست کو ملزمہ کے متعلق بتایا کہ اُسے اپنے ساتھ لیے بغیر نہیں جائے گا۔ سکھ نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ وہ پاکستان چلا جائے ورنہ اُسے بیوی تو نہیں ملے گی، مارا ضرور جائے گا۔ وہ نہ مانا۔ اس نے سکھ سے کہا کہ اگر مرد ہو تو دوستی نبھاؤ۔ یہ سکھ چونکہ اس کا دوست تھا اس لیے اُسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ملزم کی شادی ملزمہ کے ساتھ کس طرح ہوئی تھی۔ وہ دونوں کی قربانیوں اور محبت کو جانتا تھا مگر اُس کے لیے سب سے زیادہ ٹیڑھا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ملزم کو چھپائے کہاں۔ سکھ مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ ان کی نگاہوں میں دوست اور دشمن میں کوئی فرق نہیں رہ گیا تھا۔ ان کی کرپانیں اور برچھیاں مسلمانوں کا خون مانگتی تھیں۔

اس سکھ نے اپنے دو تین سکھ دوستوں کی مدد سے ملزم کو چھپا لیا اور اُس کی بیوی (ملزمہ) کی تلاش شروع کر دی۔ صرف یہ معلوم کرنے میں ایک مہینہ گزر گیا کہ ملزمہ کے گاؤں پر کن لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ دو چار سکھوں کے متعلق پتہ چلا تو اُن کے گاؤں جاکر لڑکی کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ لڑکی تو نہ ملی، چند ایسے سکھوں کا پتہ چل گیا جو اس حملے میں شامل تھے۔ اس طرح دو مزید مہینے گزر گئے۔

وہ لاشوں سے اُٹھے اور ملے

قصہ مختصر یہ کہ چار مہینے گزر گئے، ملزم کو اپنی بیوی کا سراغ نہ ملا۔

وہ وہاں سے آنے پر راضی نہیں تھا لیکن اب اُسے اور زیادہ چھپایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سکھ دوست اور اُس کے دوستوں نے اُسے بتایا کہ جس محنت سے انہوں نے لڑکی کو تلاش کرنے کی کوششیں کی ہیں، اگر لڑکی یہاں ہوتی تو ضرور مل جاتی۔ وہ پاکستان چلی گئی ہے۔ ملزم بادلِ نخواستہ ان سکھوں کی مدد سے پاکستان آ گیا۔ لاہور میں وہ ریفیوجی کیمپ میں گیا۔ اس سے ایک دو روز پہلے ہی اُس کے علاقے کے مہاجرین کیمپ سے جا چکے تھے۔ اُس وقت تک کیمپ کا یہ عالم تھا کہ بارکوں میں، برآمدوں میں، میدانوں میں، دُور دُور تک، لٹی پٹی مخلوق پھیل گئی تھی۔ سارا لاہور ریفیوجی کیمپ بن چکا تھا۔ راوی روڈ کے دونوں طرف پناہ گزین پڑے تھے۔ سرائیں اور کھنڈروں میں، ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانوں میں اور جہاں کہیں سر چھپایا جا سکتا تھا مہاجرین نے پناہ لے لی تھی۔

ملزم ایسی ہر جگہ گیا جہاں مہاجروں نے پناہ لے رکھی تھی۔ اس کے بیان سے معلوم ہوتا تھا جیسے اُس نے لاہور کی ہر ایک اینٹ اور ہر ایک پتھر اکھاڑ کر دیکھا ہو، مگر اُسے ملزمہ کا اور اپنے خاندان کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر وہ واہگہ اور گنڈا سنگھ والا بھی گیا۔ آخر لاہور میں اُسے ایک آدمی مل گیا۔ اس نے اُسے اس کے خاندان اور برادری کے متعلق بتایا۔ اسی آدمی کی راہنمائی اور سی مالی مدد سے وہ اس گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اس کی برادری کے کئی باد ہو چکے تھے۔ اُسے دیکھ کر سب بہت حیران ہوئے کیونکہ اس کے نہ اطلاع ملی تھی کہ مارا گیا ہے۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ جس آدمی

نے اس کی موت کی اطلاع دی تھی، اُس نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ اُس نے جو لاش دیکھی تھی اس کا سر کُھلا ہوا تھا۔ چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا اور وہ بالکل ملزم کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ ملزم کی ایک سال کی غیر حاضری بلکہ گمشدگی نے اُس کی موت کی اطلاع پر تصدیق کی مہر ثبت کر دی۔

ملزم نے اقبالی بیان میں کہا کہ ملزمہ کی جدائی اُسے اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ اُس کی بھوک اور نیند ماری گئی تھی۔ برادری نے (بعد کے انکشاف کے مطابق) تین چار ایسے آدمیوں کی زبانی یہ خبر مشہور کرائی کہ ملزم کی بیوی مشرقی پنجاب میں ماری گئی ہے اور اُس کا خاندان لاپتہ ہے۔ ملزم کو یقین دلا دیا گیا کہ ملزمہ ماری گئی ہے۔ اس کے بعد ماں نے اسے دوسری شادی کے لیے راضی کرنا شروع کر دیا۔ ملزم کا باپ مر چکا تھا۔ ماں کے جذبات کا ملزم کو بہت خیال تھا۔ اُس نے ماں سے کہا کہ اس کا دل ذرا سنبھل جائے تو وہ شادی کرے گا۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ گاؤں میں کوئی ایسا رشتہ بھی نہیں تھا جو ملزم کو ملتا۔ ہندوستان میں ملزم کی مالی حالت اور برادری میں پوزیشن اچھی تھی کیونکہ اس کی اراضی بہت تھی۔ پاکستان میں آ کر وہ بات نہ رہی۔ اس کی ماں اکیلی تھی۔ ملزم کے متعلق اطلاع ملی تھی کہ مر گیا ہے۔ گھر میں اور کوئی سیانا مرد نہیں تھا، اس لیے انہیں معمولی زمین ملی۔ دوسرے گھرانوں کو خاصی اراضی مل گئی۔ اس وجہ سے ملزم کا شمار کمزور اور غریب لوگوں میں ہونے لگا۔ اُس نے بٹائی پر زمین لے لی۔ اس طرح وہ مزارع بن گیا۔ مقتولہ کو طلاق مل گئی۔ یہ بھی سب کو علم ہو گیا کہ مقتولہ کو بدکاری کے

الزام میں طلاق مل گئی ہے۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ اُس کا رشتہ لینے کے لیے کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ لڑکی جوان تھی۔ اس کے باپ نے ملزم کی ماں سے کہا کہ وہ اس کی بیٹی اپنے بیٹے کے لیے قبول کرے۔ ماں نے بیٹے سے کہا اور منت کی کہ وہ اس لڑکی کو قبول کرے۔ لڑکی کے باپ نے ملزم کو جہیز کے طور پر دو ایکڑ نہایت اچھی زمین پیش کی۔ ملزم نے زمین کی خاطر تو نہیں ماں کی خوشنودی کے لیے چھوڑی ہوئی لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔

ملزم نے اسے بیوی کا درجہ دے دیا لیکن ملزمہ کو دل سے نہ اتار سکا۔ تاہم بیوی کے ساتھ اُس نے کبھی بدسلوکی نہیں کی۔ اُس نے بیوی سے صرف یہ کہا تھا کہ تمہیں بدنامی کی وجہ سے طلاق ملی ہے۔ اگر تم نے مجھے بھی دھوکا دیا تو سارے گاؤں کے سامنے تمہاری گردن پر چھری پھیر دوں گا۔ ہماری نگاہ میں ملزم اتنا دلیر اور غیرت مند تھا کہ اس نے جو کہا وہ کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق یہ بیوی ہمیشہ اس کی وفادار رہی اور اس کی خدمت بھی کرتی رہی۔ ملزم پیر پرست اور خانقاہوں کا شیدائی تھا۔ وہ ابھی تک دعائیں کراتا پھر رہا تھا کہ اُس کی پہلی بیوی اُسے زندہ مل جائے۔ اُسے اس خانقاہ کا پتہ چلا جس کا عرس ہونے والا تھا۔ وہ عرس پر چلا گیا اور وہاں اُسے پہلی بیوی نظر آ گئی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ تھی۔ ملزم بے قابو ہو گیا۔ اگر ملزمہ اُسے دیکھ کر اشارہ نہ کر دیتی تو ملزم اُسے اٹھا کر دوڑ پڑتا۔

یہ آپ ملزمہ کی زبانی سُن چکے ہیں کہ اس کے بعد وہ کس طرح ملتے رہے اور انہوں نے کیسا بھیانک پروگرام بنایا۔ ملزمہ نے جس طرح اپنے خاوند سے طلاق مانگی، اُسے پریشان کیا اور پھر اُسے قتل کیا وہ بھی آپ سُن چکے ہیں۔ اب ملزم کی زبانی سنیئے کہ اُس نے اپنی دوسری بیوی سے کس طرح آزادی حاصل کی۔

اُس نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ اسے طلاق دینا چاہتا ہے۔ بیوی سمجھی کہ وہ شاید اس کے چال چلن پر شک کر رہا ہے۔ وہ قسمیں کھانے لگی لیکن یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ ملزم نے یہ تو سوچا ہی نہیں کہ کسی عالم سے پوچھ لیتے کہ شریعت کے لحاظ سے اُس کی پہلی بیوی کی پوزیشن کیا ہے۔ یعنی ملزمہ کا پہلا خاوند زندہ تھا لیکن اس کی موت کی غلط خبر نے اسے کسی دوسرے کی بیوی بنا دیا۔ یہ شریعت کا مسئلہ تھا۔ یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ پہلے خاوند کی موجودگی میں طلاق کے بغیر وہ دوسرے آدمی کی بیوی رہ سکتی تھی یا نہیں۔ انھوں نے جذبات سے مغلوب ہو کر ایسی جاہلانہ کارروائی کی جس کی کامیابی کے راستے میں پھانسی کا تختہ بھی تھا۔ ملزم نے دوسری بیوی کو پریشان کرنا شروع کر دیا۔ ملزم کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل وجہ کیا ہے۔ آخر یہ لڑکی انتقاماً منہ پھٹ ہو گئی۔ خاوند ایک کہتا وہ دو سناتی۔ اس نے دو تین بار ملزم کی ماں کی بھی بے عزتی کی اور اس پر یہ الزام عائد کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو اس کے خلاف بھڑکاتی ہے۔

آخری روز جس شام ملزم نے ملزمہ کے ساتھ قتل طے کیا تھا، ملزم نے بیوی پر رحم کیا کہ اُسے موت سے بچانے کے لیے کہا کہ وہ طلاق لے لے اور اپنے ماں باپ کے پاس چلی جائے لیکن اُس نے ملزم کو دھمکی دی کہ وہ طلاق دے کر تو دیکھے۔ ملزم نے اُسے خوب پیٹا۔ وہ اندر بیٹھی رو رہی تھی۔ ملزم کی ماں باہر نکل گئی۔ ملزم نے قتل کی سکیم پہلے ہی بنا رکھی تھی اور سکیم ایسی بنائی تھی جس کے متعلق اُسے اُمید تھی کہ قتل کو چھپائے رکھے گی اور وہ پکڑا نہیں جائے گا۔

اس کے مطابق اُس نے اندر سے سیڑھی اُٹھا کر مکان کے ایک موزوں پہلو کے ساتھ لگا دی۔ اُس روز اس کی بیوی نے دوپہر کو بھی کھانا نہ کھایا اور شام کو بھی نہ کھایا۔ دیہات میں لوگ شام ہوتے ہی سو جاتے ہیں۔ ملزم بیوی کو چھت پر لے گیا۔ وہ روزانہ چھت پر ہی سوتے تھے۔ بیوی (مقتولہ) اوپر جانے پر رضامند نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی کہ تم مجھے بیوی ہی نہیں سمجھتے تو مجھے اوپر اپنے پاس کیوں لے جاتے ہو۔ وہ نہیں جا رہی تھی۔ ملزم نے سختی کرنے کی بجائے پیار کی جھوٹی قسمیں کھائیں اور اُسے اوپر لے گیا۔

وہ اُسے فوراً قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے گاڑی کے وقت کا علم تھا۔ اُس نے یہ سکیم بنائی تھی کہ گاڑی گزرنے کے وقت سے آدھا پونا گھنٹہ پہلے اُسے گلا گھونٹ کر مارے گا اور وہ آدھی رات کا وقت ہوگا۔ لوگ سوئے ہوئے ہوں گے۔ وہ لاش ریلوے لائن پر رکھ آئے گا۔ میرے

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے اس نے کہا کہ اُسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ مرنے کے تین چار گھنٹے بعد لاش کو کاٹو تو خون نہیں نکلتا۔

آخری سفر اور زندگی کے میلے

اُس نے بیوی کو اوپر لے جا کر کہا کہ سو جاؤ۔ بیوی نے کہا کہ وہ اُس کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی ہے۔ باتوں باتوں میں جھگڑا شروع ہوگیا۔ بیوی نے ایسی جلی کٹی باتیں کہہ دیں کہ ملزم کو سخت غصہ آیا۔ وہ اُسے تھوڑی دیر بعد قتل کرنا ہی چاہتا تھا۔ اُس نے غصے سے باؤلا ہو کر بیوی کا گلا دبوچ لیا اور چھوڑا اُس وقت جب وہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اس نے لاش کو چارپائی پر ڈال کر اُوپر چادر ڈال دی اور گاڑی کے وقت کا انتظار کرنے لگا۔ گاؤں کی آخری آواز بھی خاموش ہوگئی۔ تقریباً چار گھنٹے بعد ملزم نے لاش کندھوں پر ڈالی مگر گنوار ہونے کی وجہ سے یہ نہ سوچ سکا کہ مقتولہ کی جوتی بھی ساتھ لے جاتا۔ جوتی وہیں پڑی رہی۔

وہ سیڑھی سے اُترا۔ گاؤں میں کسی کو نظر آئے بغیر باہر جانے کا راستہ اس نے دیکھ رکھا تھا۔ وہ گاؤں سے نکل گیا اور لاش ریلوے لائن پر اس طرح رکھ دی کہ گردن لائن پر اور دھڑ دونوں لائنوں کے درمیان تھا اُس وقت گاڑی ریلوے سٹیشن پر کھڑی تھی۔ وہاں سے سٹیشن تقریباً ڈیڑھ میل دُور تھا۔ اُسے انجن کی بتی نظر آ رہی تھی۔ وہ لائن سے تھوڑی دور

ایک درخت کی اوٹ میں جا کھڑا ہُوا۔ گاڑی آئی۔ لاش کے قریب آ کر انجن نے وِسل بجائی اور پھر ساری گاڑی لاش کے اوپر سے گزر گئی۔

ملزم نے جا کر دیکھا کہ سر دھڑ سے کٹ کر ذرا دُور جا پڑا تھا۔ اُس نے یہ بالکل نہیں دیکھا کہ وہاں خون تھا یا نہیں۔ وہ گاؤں میں گیا اور سیڑھی سے اوپر چلا گیا۔ صحن میں اُس کی ماں سوئی ہوئی تھی۔ صبح کے وقت اُس نے باہر سے سیڑھی اٹھائی اور اندر لے جا کر ماں کو ڈانٹ دیا کہ اُس نے یہ سیڑھی باہر ہی رکھ دی تھی۔ اُسے اب اُمید تھی کہ کوئی نہ کوئی آ کر اطلاع دے گا کہ اُس کی بیوی گاڑی کے نیچے آ کر مر گئی ہے۔ ایسے ہی ہُوا۔ وہ گاؤں والوں کے ساتھ دوڑتا گیا۔ بیوی کی لاش دیکھی اور جو سکیم اس نے سوچ رکھی تھی، اُس کے مطابق اُس نے تھانے میں اطلاع دی اور کہا کہ اس کی بیوی نے خودکشی کر لی ہے مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ تھانے میں ایک کی بجائے دو تھانیدار بیٹھے ہیں جو بال کی کھال اتار کر دکھا سکتے ہیں۔

ملزم نے بیان سب انسپکٹر کی موجودگی میں دیا تھا۔ پولیس والے جذبات کے لحاظ سے پتھر ہوتے ہیں۔ پولیس کا کام ہی کچھ ایسا ہوتا ہے۔ لیکن ان دونوں میاں بیوی کی کہانی نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ ہم انہیں قانون کے شکنجے سے نہیں بچا سکتے تھے۔ سب انسپکٹر اسی آدمی کو لینے آیا تھا، مگر وہ ایسی واردات میں ملوث تھا جو ملزمہ نے کی تھی۔ اقبالی بیان کسی ملزم کو سزا دلوانے کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ ملزم اقبالی بیان میں جن افراد کا ذکر کرتا ہے، اُن کی حیثیت گواہ یا ملزم کی ہوتی ہے۔ اُن سے پوچھ گچھ اور

تصدیق ضروری ہوتی ہے اور اقبالِ جرم میں جن اشیا کا ذکر ہوتا ہے وہ برآمد کر کے عدالت میں پیش کرنی پڑتی ہیں اور جن واقعات کا ذکر ہوتا ہے انہیں صحیح ثابت کرنے کے لیے شہادت فراہم کی جاتی ہے۔ اگر پولیس اقبالی بیان کی ایک بھی کڑی کمزور رہنے دے تو ملزم بری ہو سکتا ہے۔ ملزمہ کے اقبالی بیان کی کڑیاں ملانے کے لیے سب انسپکٹر ملزم کی شہادت لینے اور ملزمہ سے اس کی شناخت کرانے کے لیے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اب خان صاحب کو ملزمہ کی ضرورت پیش آ گئی کیونکہ اُن کے ملزم نے اقبالی بیان میں ملزمہ کا ذکر کیا تھا۔

میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکوں گا جب ملزم اور ملزمہ ملے تھے۔ یہ اس طرح ہوا تھا کہ ہم ملزم کو سب انسپکٹر کے تھانے میں لے گئے تھے۔ ملزم کو ہتھکڑی لگی ہوئی تھی اور ملزمہ حوالات میں بند تھی۔ قاعدے قانون کے مطابق ہمیں ملزم کو وہاں لے جانا چاہیئے تھا یا نہیں یہ الگ بحث ہے۔ ہم تینوں تھانیداروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ انہیں کسی بہانے ملوائیں گے۔ وہاں لے جا کر سب انسپکٹر نے ملزمہ کو حوالات سے نکال لیا اور اپنے کمرے میں لے جا کر ملزم کے ساتھ بٹھا دیا۔ ملزم کی ہتھکڑی نہیں کھولی جا سکتی تھی اور ایک کانسٹیبل کا اُن کے پاس ٹھہرنا لازمی تھا۔ ہم تینوں باہر نکل آئے تھے۔

دونوں کے اقبالی بیان ایک ہی مجسٹریٹ نے قلمبند کیے تھے۔ دونوں تھانوں کی کچہری ایک ہی تھی۔ خان صاحب نے استغاثہ نہایت

مستحکم تیار کیا تھا۔ مقدمہ چلا۔ مجھے اس کیس سے بہت دلچسپی تھی۔ آخر سات آٹھ ماہ کے بعد دونوں کو عمر قید ہو گئی۔ عمر قید چودہ سال ہوتی ہے۔ ہر سال قیدی کو کچھ معافی دی جاتی ہے۔ قید کے عرصے کی معافی ملا کر قیدی دس سال بعد رہا ہو جاتا ہے۔

۱۹۶۳ء کے وسط کا ذکر ہے۔ ان دونوں کو جیل میں گئے گیارہ سال سے چند مہینے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ مجھے ایک روز یہ واردات یاد آ گئی۔ میں اُس تھانے میں گیا جہاں کبھی خان صاحب ہوا کرتے تھے۔ جب کوئی آدمی کسی جرم میں قید کاٹ کر گھر آتا ہے تو متعلقہ تھانے والے اُس کا نام ریکارڈ میں لکھ لیتے ہیں اور تھوڑا عرصہ در پردہ اس کی نگرانی کرتے ہیں کیونکہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ جیل میں عادی مجرموں کے ساتھ رہ کر وہ بھی عادی مجرم نہ بن گیا ہو۔ میں نے وہاں کے تھانیدار سے پوچھا کہ اپنی بیوی کا قاتل عمر قید پوری کر کے آ چکا ہو گا۔

اُس نے ریکارڈ دیکھ کر بتایا کہ آٹھ نو مہینے ہوئے وہ آ گیا تھا۔ گاؤں قریب ہی تھا۔ میں وہاں چلا گیا۔ اُس سے ملا۔ وہ بڑے پیار سے ملا اور مجھے گھر لے گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ خاوند کی قاتلہ اُس کی بیوی تھی۔ دونوں دس دس سال پورے کر کے رہا ہوئے تھے۔ یہ آدمی اُسے اپنے گاؤں لے آیا تھا اور انہوں از سر نو نکاح پڑھا لیا تھا۔ ان کی عمر سینتیس اڑتیس سال ہو گئی تھی مگر وہ اپنی عمر سے کم لگتے تھے۔ مقتولہ کا باپ بھی مر چکا تھا اور قاتل کی ماں بھی۔ برادری انہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی لیکن وہ آپس میں مطمئن تھے۔